

ایک بار سنو

فضول گوئی کرتے سن رہا تھا۔ اب بھی اس نے سانس بیٹھی کافی کے بڑے سے مگ سے چسکیاں بھرتی اپنی ناراض ناراض سی بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گوہر افشانی کی۔

”یار ازکی! اپنی آپنی کو تم ہی مشورہ دے دو۔ میری تو وہ ایک نہیں سننے والی۔“

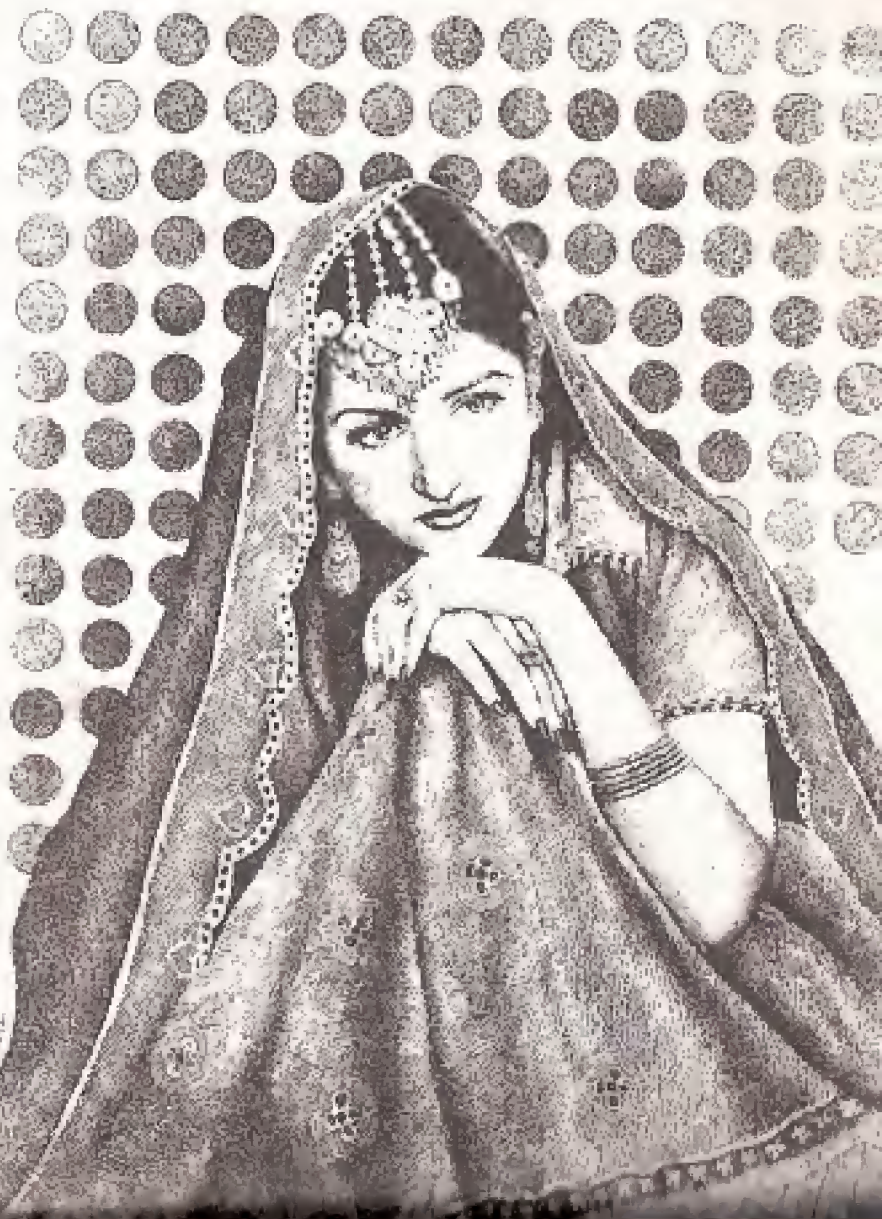
”وہ کیا؟“ اس کے اشتیاق پہ اشعب اور چڑھ گیا۔
”ان سے گزارش کرو کہ تم از کم اپنے پال کھلے مت چھوڑا کریں۔ ایسا لگتا ہے عزیز میاں قوال کی یارٹی میں شریک ہو گئی ہیں۔ وہ نہیں ہوتے۔ بھلا کہا

یار ازکی!“ جنید کے بڑی رازداری سے مخاطب کرتے یہ وہ اس کی جانب جھکی تو جہاں اس کے ”یار“ کہنے پہ اشعب پہلے ہی تلملا اٹھا تھا۔ وہاں نئی نویلی چند روزہ دلہن کی خود پہ سے توجہ ہٹے دیکھ کے اور بھی جل بھن گیا۔ اس نے بڑی ناگوار سی نظروں کے ساتھ دائیں جانب پڑے صوفے پہ نیم دراز جنید کو دیکھا۔ جس کے ایک جانب صوفے کے بازو پہ بجلی چڑھی بیٹھی تھی تو دوسری جانب ازکی جھکی ہوئی بڑے اٹھماک سے اس کی بات سن رہی تھی۔ جیسے کہ وہ کوئی بہت ہی دلچسپ بات کرنے والا ہو۔ جبکہ اشعب مسلسل اسے

ناولٹ

کہتے ہیں انہیں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ہم نواس۔۔۔۔۔ عزیز میاں قوال اور ہم نواس۔۔۔۔۔ ایسا لگتا ہے ابھی زمین پہ پھسکڑا ماریں گی۔ دونوں ہاتھ زانو پہ اور سر گھماتے ہوئے دھمال۔۔۔۔۔ اس کے بے ہنگم قدموں میں ازکی اور بجلی کی کھی کھی کھی بھی شامل ہو گئی۔ ”ارٹی نے مگ سائیڈ ٹیمبل پہ پٹا اور سیلوئیں ٹیص کے فرضی کف چڑھائے ہوئے دنگل کا سکنل دینے لگی۔ جنید نے سالیوں کو پرے دھکیلا اور دونوں کان کھینچتے ہوئے سر دھننے لگا۔

”میری توبہ۔۔۔۔۔ میری توبہ۔۔۔۔۔ میری توبہ۔۔۔۔۔“ اس کی اونچی اونچی تانوں پہ ایک بار پھر قہقہے بکھر گئے۔ سب جانتے تھے وہ طوطی کو توبہ کہہ کر چڑایا کرتا ہے اور اس کے گھنے گھنگھر پالے سے بال تو سدا اس کے مذاق کی را میں رہا کرتے، ”خصوصاً“ جب بھی بڑے عرصے بعد وہ



پانچ بن بھائیوں میں ازکی کا نمبر تیسرا تھا۔ باصر بھیا کے بعد طوطی آتی بڑی چھٹی اس سے اور باسط کے بعد چلی دونوں اس سے چھوٹے تھے۔ ان کا گھرانہ خاصا خوش باش سا گھرانہ تھا۔ طوطی آلی اور باسط دونوں کو بڑا سخی ابو کی جانب سے ملی تھی۔ خود وہ اور چلی بھی خوش مزاج ہی تھیں۔ باصر بھیا البتہ بن بھائیوں میں بڑے ہونے کی وجہ سے کچھ پیچیدہ مزاج تھے لیکن سڑیل پر حال نہیں تھے۔ خیر ان کی طرف سے جو کسر رہتی تھی وہ ان بن بھائیوں نے پوری کر دی۔ اوپر اوپر چیلے چھوڑی، قہقہے، کھیریں ان کی دلن گھر میں ایک خوشگوار اضافہ تھیں اور پھر چنید بھائی بڑے کیا گئے بیٹے سب لوگ کہتے تھے وہ اپنے چچا (ازکی کے والد) کی کاپی ہیں۔ ان کا رشتہ بھتیجہ سے چچا کی چلی کی طرف رہا۔ پہل تک کہ چچا کی سب سے بڑی صاحبزادی کے حقوق اپنے ہم کرا کے چھوڑے۔ دونوں کے درمیان ہر وقت جاری نوک جھونک سے سب ہی لطف اندوز ہوتے۔ وہ اسے گھرے بالوں اور فرہنگی مائل سراپے کی بنا پر تو اوال اور دھسلور کے نام سے کے پڑا گئے اور وہ چنید کی چھوٹی چھوٹی چاندنی آنکھوں اور باریک سی مونچھوں کی وجہ سے ”پرئس آف نیپال“ کہہ کے چھیڑتی۔

بھائیوں کی تکرار پر بھانے میں پیش پیش رہتیں۔ وہ طوطی پر جملہ اچھا تاؤ بھی ان ہی کے قہقہے سب سے بلند ہوتے، طوطی جو ”با“ جیسے یہ کوئی فقرہ چست کرتی تو بھی داد دینے والوں میں بھائی آگے ہوتے۔ باسط بہ سارے داؤد تھیں ان ہی پر آریا۔ اسی اور بھائیوں پر مسکراہٹ لیے لیے ہنستے چیلے گھر آنے کو ٹھانیت سے کہتے اور اسی قہقہوں گنگناہٹوں کی فضا سے نکل کر یکدم وہ سڑیل کے چلہ سٹائے میں لگی تو دونوں میں کھیرا اُٹھی۔ اس سٹائے میں اگر کوئی آواز گو بھی تھی تو وہ اشعب کی تھی اور اس کی باتیں اس قدر جلی کٹی ہوئی تھیں کہ ازکی کو دن بھر چھایا سٹانا غصیت لگتا۔ چھتے دن بعد شبانہ بچیا آئیں تو بجائے روتی کے گھر میں اور ہی عجیب طرح کی دہشت سی

پھیلا جاتیں۔

پہلے دو ہی بن بھائی تھے۔ بچیا اشعب سے اس کے بعد چھ سال بڑی تھیں۔ لیکن ان کی شادی کو بہت دور گزر چکے تھے اور چار بچے بھی تھے جس سے ظاہر تھا کہ خاصی کم عمری میں ہی انہیں بیاہ دیا گیا تھا۔ اشعب کے والد کو گزرتے آتے سڑیل ہو چکے تھے۔ اچھے ساں کا رویہ اسے ٹارٹل ہی لگتا۔ دیگر ساسوں کی طرح انہیں اس کے سونے چانگنے کے اوقات یا کھانے پھرنے کے پروگراموں پر کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔ الگ بات کہ کھوتے پھرنے کی فہمیت کم ہی آتا کر لی۔ اشعب سارا دن آتش گزاری کے بعد شام کو گھر سے نکلنے بھی گوارا نہ کرتا تھا اور چھٹی کے دن کو بھی بھر پور عیاشی کے ساتھ منانے کا ہلوی تھا۔

بارہ بچے سو کر اٹھتا بھاری ناشتے کے بعد کچھ دیر لی وی دیکھا جانا چند ضروری فون کرنے کے بعد جا دوستوں کی طرف نکل جاتا۔ دوست خود ہی آجاتے۔ ہاں اگر کسی چھٹی والے دن بچیا کی آمد ہوتی تو اس کی خیر کا دورانیہ بھی کم ہو جاتا اور بھلے بھالے بچوں کو لے کے کوٹنگ پھرنے پھرنے بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ ازکی کو اس کے بہن یا اس کے بچوں کے ادا اٹھانے پر غرض نہ ہوتا اگر وہ نوبیا بھائیوں کے بھی ہاتھ روز چاؤ کر لیتا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ شادی کے بعد نیکی سے ملنے والی دعوتوں کو اس نے پس پشت ڈال کر شوہر کی خواہش کے مطابق اس کے دوستوں اور چلی کی طرف سے ملنے والی دعوتوں کو ہی اولیت دی۔ چلی کی طرف سے صرف اشعب کے بچا اور ماموں سے ملنے جو کیا تھا تھی کہ شبانہ بچیا نے کنگنا بھی رسمی دعوت کا ذکر نہیں کیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی یہ اور بات کہ ویسے کے دوروں بعد بھی اشعب اسے بچیا کو مضامین، گرامر لے گیا تھا اور کبھی بار کے چلنے میں بھی بچیا کی رودی چیلے میزبانی اور شنگ روپے نے اس کا دل مکدر کر دیا۔ اس کا خیال تھا نیکی کی طرف سے ہونے والی پر خلک دعوتوں کے ذریعے وہ اشعب کو بلور کرانے کی

اس کی اپنے خاندان والوں میں کیا قدر و قیمت تھی۔ ان کی شادی کی طرف ہونے والی دعوت میں ہی اس کی وہ تھی کہ اس نے آئندہ اس کے نیکی کی شادی کے لیے شنگ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

اس نے شادی اور ناشتہ کھی کسی قیمت پر برداشت نہ کیا۔ اگر تھمرے گھر والوں کے یہی الطوار اسی انہیں دلا کر کے لحاظ میں تو کچھ تیز کا مظاہرہ کرنا تھا۔ چاہے جھوٹ موت کا ہی سہی لیکن اسے اس سے گناہ نہ تھا کہ میرے سر پر لیا گیا اور اسے رکھ کر کھلاؤ جو بڑے سے بھی نہیں ملتے صاحب کے عادی ہیں جبکہ میں مختلف مزاج کا

اس نے کتنی کوشش کی کہ وہ اور کچھ نہیں تو کم از کم طوطی آلی کے گھر تک تو اس کے ساتھ چلا جائے لیکن وہ اس میں بیوی سے تو اسے خاص تیر تھا۔ ہر بار اسے مصروفیت اور چھٹی والے دن آرام کا بہانہ دیا۔ ایسے میں جب وہ آرام سب بھول کے اپنے گھر کو گاڑی بھر کے میکڈونلڈ اور سندیلے جاتا تو اس کے دل میں ملال تو بھر جاتا تھا۔

ان دنوں تھا اور بچیا نے اپنی آمد کی پیشگی اطلاع اسے کوئی دے دی تھی۔ بن کا دارا یہ بیک اینڈ تھیں اس نے کتا تھا اور ازکی کا گوشت کے سارے برآمد تھا۔ وہ ہاتھ تھی کہ بچیا اگر رات گزارنے کے ارادے سے اس کا تھلا بھائی صاحب لانا ”ساتھ ہوں گے۔ یوں لایا گیا۔ آئیں تب بھی گھر کی فضا میں عجیب سی آوازیں اور سوگوار سی چھا جاتی۔ ان کی تپ ہوئی بھو میں کہ رات رات شنگ لے کر تپتی تھی تھوڑی سی باتیں سن سن کر کہہ رہی تھی۔

ان کا اپنا سو تو ہمہ وقت خراب ہی رہتا۔ ان کے بیڑے کے سرگوشیوں میں بجائے کیا تھی رہتیں کہ ان کے بارے سے بھی افسردہ بننے لگتی۔ ویسے تو ان کا شروع دن سے اس کے ساتھ تقریباً دوستانہ ہی تھا۔ ان بچیا کی موجودگی میں وہ بہت سے لیا یا انداز ہی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

مجھے روکھنے نہ دیتا
نکیت عبد اللہ * قیمت 250 روپے

موشم تھا بے قرار
فریدہ اشفاق * قیمت 300 روپے

میں سے اس کے بیچ سفر
زہرہ ممتاز * قیمت 180 روپے

اندھیرے سے اُجالے تک
عاصمہ نقی * قیمت 150 روپے

خوبصورت سرورق، آفمنٹ پیسیر
خوبصورت چھپائی، دیدہ زیب مضبوط جلد

شائع ہوئے گئے ہیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 راز و بازار کراچی فون 2216361

اپنے رکھیں۔ اس تمام صورتحال کے پیش نظر ظاہر ہے کہ ان کی کو ان کی آمد کی اطلاع سن کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن حامد بھائی صاحب کے ہمراہ آنے میں تو بھیا انتہائی ناقابل برداشت ہو جاتیں۔ ان کی کو خوش ہوئی تھی کہ سارا گھر ان کے شوہر کے آگے پیچھے پھرے اور وہ خود شوہر کے سامنے ان کے کور بچوں کے بھی زیادہ سے زیادہ ناز اٹھائے جاتیں۔ اسی اور اشعب تو دایلو کے حسب شان بلکہ ضرورت سے کیس بڑھ کے پروٹوکول دینے میں پیش پیش رہتے تھے لیکن ان کی جان جالی بھی بناوٹ کا مظاہرہ کرنے سے۔ اگرچہ وہ خاصی اچھی میزبان تھیں اور کام کلج کی بھی چور نہ تھی لیکن زبردستی کر لینی کئی عزت اور وجوہات سے لی گئی اہمیت کے خلاف تھی۔ اسے بھیا کا اس گھر پر آئے شوہر پر حق دینا برا نہ لگتا تھا۔ وہ ان کی حیثیت کو تو تسلیم کرتی تھی لیکن اجادہ داری قبول کرنے سے انکاری تھی۔ یہ الگ بات کہ بیواری کامیہ انعامی فی الحال اس کی ذات تک ہی محدود تھا۔ وہ ان کے آئے یہ نہیں یہ نہیں ہوتی۔ بھیا کی دوستی لیکن کرتی وہی خواشعب اور اسی اس سے چاہتے تھے۔

اس وقت بھی وہ ناشتے کے بعد سے ہی بچن میں تھکی ہوئی تھی بھیا کو بچوں کو چھٹی کے بعد اسکول سے سیدھا لائیں لے کر آتا تھا جبکہ بھائی صاحب آفس کے بعد شام کو ٹھہر جاتے۔

آٹا گوندھ کر فریج میں رکھنے کے بعد اس نے چولہے پر رکھی اور پیچیدگیوں کی طرف توجہ کی جب اسی جاں اندر داخل ہوئیں۔

”ایسا پکار رہی ہو ان کی؟“ عمو! یہ سوال کم ہی کیا کرتیں۔ جب سے انہوں نے ان کی کو بچن کا چارج مکمل طور پر سنبھال لیا تھا کہ ان کے معاملہ بھی اس پہ بھی بھروسہ رکھا تھا لیکن سچ معاملہ اور تھا بھیا کو آتا ہوتا تو اپنی نگرانی اور مشورے سے کھانا پکاتیں۔ اب تو چھوٹا میں ہی ان کی کو بھی اذیر ہو گیا تھا کہ بھیا کو سبزیوں مرغوب ہیں اور وہ بھی مشکل ترین طریقے سے بنی ہوئی کپتے چاول اور دال وغیرہ کی شوق سے کھاتے ہیں

سبزیوں میں سوائے کلو کے اور انہیں کچھ پسند نہیں گوشت بھی نہیں کھاتے خصوصاً ”سائن میں“ ہیں قرولی چکن، کٹے کباب وغیرہ کھا لیتے ہیں جبکہ حامد بھائی صاحب کے گوشت خود ہیں ان کے لیے انچل پر ٹکٹف کھانے پیتے۔

ان کی انہیں بتانے لگی۔

”بھیا والے بھرے کھنے کر لیے بہت پسند کرتی ہیں ان کے لیے وہی بیماری ہوں بچوں کے لیے ہمارے کھڑی دال اور وہی بڑے ہنگر میں چائپ بھی چڑھا رکھی ہے آفس بھی لو کھانا جاتا ہے اور آپ کو تو بتا ہے اشعب خالی دال سبزی بھجوا رہے ہیں ناراض ہوتے ہیں۔“ آفس سے ملازم ہر روز بی کام میں آکر کھانا لیتے آتا تھا۔

”اور کچھ پکاتا ہو تو بتا دیجیے“ اس نے چلے ہوئے کر لیں پر ٹکٹف ملے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“ میوہ خیال ہے ٹکٹف ہے آخر رات کو بھی تو پکاتے، حامد ہوں گے اور کل وہ سہ بھی۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے کھینے لگیں۔

”ایسا کرو آج رات بیانی ہی پکا لو کباب کے ساتھ بھی چل جائے گی اور یہ وہی بڑے بھی رات کے لیے ہی رہنے دو۔ کل وہ پھر کو پکائے کے ساتھ تو رہنا چکن کر لیں میں سے کچھ بھی نکالے۔“

”جی! ٹکٹف ہے۔“ وہ دو پکوڑوں کا پیکٹ کھول کر بنگوٹے لگی تھیں واپس ایئر کنڈیشننگ جار میں بند کر لے لگی۔

”اب دیکھو تا پورا مینہ پڑا ہے آگے تو دیکھ بیل کے ہی پکاتا پڑا ہے۔ ایک ہی پتہ میرا کمانے والا سب کچھ ہانڈی روٹی میں ہی تو چھپ چھوٹکتی۔“

ان کی شوق ضرور تھی لیکن اس نے اپنا تہو محفوظ رکھا اور جب چائپ چائپ میں ڈالنے کے لیے وہی میں سالے پھینکتے لگی۔

”ہاؤ! جیتے وہ میں کروں تو اپنی کب تک لگی رہو گی اتنی گری میں۔“

”کوئی بات نہیں اسی کام ہی کہتا ہے“ چائپ بھی

”بس۔“ وہی ڈال کر بھونٹا ہے اور بس۔ آپ کچھ آرام لے لیجیے۔“

”ج سے آرام ہی تو کر رہی ہوں میں جانتی ہوں کہ اللہ بڑی پھر بھی جو پتا بھی نہیں لگتے دیتیں اور کام نہ لیتی ہو پھر بھی آخر ہو تو انسان، ممکن تو ہو اور باقی ہے۔ اب سمجھو دیکھو لیٹے لیٹے کیر کڑکھ گئی ہے“ اس نے صبح سے کام میں جتی ہو۔“ اس کی تعریف کرنے میں وہ پیشہ قرولی دلی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ ان کی بے ساختہ محبت سے مسکرا دی۔

اس نے اہلی دال مختار کے حق کے حوالے کی اور اور اس سائن دسپے لگا کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

لٹے کے بعد لیٹے پل سکھائی وہ بچن میں آئی تو اسی لڑائی میں بیل گرم کر کے کر لے کر رہی تھیں عمو سے رات شرمندگی ہوئی۔ ”مرے امی! آپ کیوں اس قدر گری میں چولہے کے آگے کھڑی ہو گئیں میں اسی کر رہی تھی۔“ اس نے آگے بڑھ کے بچہ ان کے ہاتھ سے لپکا چاہا۔

”میں جانتی ہوں تم توری تھیں، تمہیں بھلا کیوں ہاتھ لگائے؟“ انہوں نے ہنسنے ہوئے اس کا ہاتھ مرے کیا۔

”نکر مت کرو! ایک آدھ ڈش بناؤں گی تو بھی تمہارے فہر کم نہیں ہوں گے سارا کرکٹ ٹیمیں ہی جائے گا۔“ ان کی نے حیرت سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں نرم سی معصومیت اور شفقت کے علاوہ کچھ تھا۔ بھیا کی شگفتگی محسوس کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔

”لجھ بھی کیا چیز ہے۔“ لفظوں کے معنی بدل جاتے۔ بھیا کی ساری روح تبدیل کر دیتا ہے۔ بھیا کے ہاتھ لگا کر اشعب کے منہ سے نکلے ہوئے تو کھڑکے لگے ہیں اوبے ہوتے۔

پورے گھر انے میں اگر کوئی ہلکی پھلکی سی گھنٹہ بات بھی کھار کر دیتا تھا تو وہی جان ہی تھیں۔ وہ سلاہ مار کر رہی تھی جب کال بیل کی آواز آئی۔ اسی جان اوبے سے ملتی ہے۔ آیا پسند ہو پچھتے ہوئے وہ اسے واپس دیتی لڑائی کی طرف لگیں۔

”بس یہ دو تین کر لے ہی کر لڑائی میں رہ گئے ہیں“

سرخ کر کے نکال لینا اور پھر سارے آٹھے ہی دم سے دینا۔ ہر امسال چھڑک کے۔“ ان کی بے چینی ان کی خوب سمجھتی تھی۔ وہ بچی پہ ظاہر کرنا نہ چاہتی تھیں کہ وہ بچن میں کام کر رہی ہیں۔ لیکن ان کا جلدی جلدی کام چھوڑ کر باہر لکھانے کا گریا اورواز ہے۔ اشعب کا ملازم تھا جو اس سے لچ لیتے تھا اور اپنی وہ بات پات میں کھانا ڈال کر باسکٹ میں رکھ دیتی تھی کہ وہ اذیر اور بکر کے قدر قدر سے چلائے کی آواز آئی۔ اسے اپنے شانوں پہ کوئی بھاری بوجھ کرنا محسوس ہوا۔

کٹے بدھنپ ہوئے ہیں وہ لوگ جن کے آپس پاس مودوں ہونے کا احساس ہی کسی کی طبیعت کو بوجھل کر دیتا ہو۔ سر جھٹک کر اس نے خود کو کشاں ظاہر کرنے کی کوشش کی اور سب سے ملنے باہر آگئی۔

جس چیز کو انی اس پہ کھا رہا نہ کرنا چاہتی تھیں وہ پہلا لقمہ لپٹتی چلی گئیں۔

”کھریے نا ہی۔“ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہ آپ کے ہاتھ کا جادو ہے۔“ ان کے چہرے پہ مسکراہٹ بڑی اجنبی اجنبی سی لگتی تھی۔ ان کی رہنمائی پلیٹ میں کباب ڈالتے ڈالتے رک کر ان کی مسکراہٹ کی بوجھ کھونٹے لگ گئی۔

”بڑے عرصے بعد آپ کے ہاتھ کا کچھ کھایا ہے ہے نا اسی۔“ وہی ڈالنے۔ وہی لذت۔ وہی خوشبو۔ واقعی ان کے ہاتھ میں کچھ تو ایسا ہے جو ہر لقمے کے ساتھ دھن دھن اترتا محسوس ہوتا ہے۔“

اور اسی جان جو ان کے پہلے فصرے پہ ہی تردید کرنے جارہی تھیں۔ پانی پوری بات سن کر مسکرا کر رہ گئیں اور یہ مسکراہٹ اس بات کی تصدیق تھی کہ دال بھرے کھنے کر لے واقعی انہوں نے بنائے ہیں۔

اور اسی کے چہرے پر مسرور سی مسکراہٹ آئی اور ہر بھیا کے چہرے سے مسکان غائب۔

ایک ایسا اچکا کے انہوں نے بڑی آفیسلی لنگا ڈالینگ ٹیبل پہ دو ڈالی۔ شامی کباب، وہی پھلے مسالے دار چائپ، ماش کی دھلی دال، پھلکے اور سلاہ۔ بس۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھلے اور پھر

تجارت کیا سوچ کر بند ہو گئے۔
 انکی ہلاکت جانے کا شکر ادا کرتی ہوئی وہاں تکین کی
 طرف پلٹ گئی۔ مگر اگر تم سچے لے کر دلوں تو وہ سچے
 سے شرمناک ہو رہی تھیں۔ اس کی چوٹی سے اڑی تک
 پیوستہ رہا تھا۔ ان کی کہیں کمر سے بالکل چپکی ہوئی
 تھی۔ دوسرے خوں میں پھٹے لپٹے کے بعد وہ لٹی لٹائی نے
 پوچھ لیا۔

”تو کتنی روٹیاں پاتی ہیں؟“
 ”بس دو تین اور ڈالیں۔“
 ”ہاں جلدی سے لے آؤ، خیر ہو گیا تمہارا تو پیسے
 ہے۔“ ان کی لہجہ کی بات پر خیر کے بچا کو کھتے لگی تھیں
 کے حلق میں نوالہ پھٹنے لگا تھا۔ اسی کی ہوس کے لیے
 فکر مند کی وجہ سے وہ بچی کے تاثرات سے بے خبر تھی
 ہی کتنی رہیں۔
 ”میں نے تو سوچا تھا کہ انہیں سے جو چیز اسی کہا ہے
 اسی سے بازار کے تان منگوا دوں پھر خیال آیا کہ
 تمہارے بچے تانہ روٹی کھاتے ہیں وہ بھی لکھری۔۔۔
 اس لیے رہے۔“

(اف ای کو کیوں یاد نہیں رہتا کہ وہ اس وقت کس
 سے مخاطب ہیں) وہ جڑ بڑ ہوئی پھر سے تو بے آگے
 جا کھڑی ہوئی جس اس وقت بچیا کی کواڑ بچلی آ رہی
 تھی۔

”میرے بچوں کی فکر کرنے کی کیا ضرورت تھی
 آپ تو اپنی لاڈلی ہو کا خیال رکھیے۔ ان کے لیے روٹی
 میں خود ہی ذلل لیں بلکہ یہاں میرے آنے کی بھی پہلا
 کیا تک تھی تھی۔ پورا پورا دن رات چلے آگے آگے
 کھڑی رہتی ہوں یہاں آگے بھی خود کا کر کھانا ہے تو
 گھر میں ہی ٹھیک تھا۔“ وہ بغیر دیکھے بتا سکتی تھی کہ
 انہوں نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ وہاں رکھ کر پیٹ پر سے
 و نکلی دی ہوگی۔

”کیسی بات کر رہی ہو شائد! میں تو۔۔۔ وہ ان کی۔۔۔
 اس بے چاری نے کب انکار۔۔۔“ بچیا کی ہراسنی کے
 بعد اسی کے ہاتھ پر پونہ پھول چلا کرتے۔ انہیں
 وضاحت دینے کے لیے بھی دھتک کے الفاظ نہ مل

پاتے۔
 ”کہاں کی بے چاری؟ کیا بے چاری کی نظر آتی ہے
 کب کو اس کے چہرے پر؟ سارا دن گھر میں کب وہ
 ہوئی ہیں حد سے حد نہیں تھیں تو چار روٹیاں ڈال لیتی
 ہوں کی اتنی ہی رات کو پتی ہیں ساتھ میں چاول، ذر
 ہوتے ہیں۔ اگر کبھی چار مسلمان آجائیں تو بازار سے
 روٹی منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔“
 ”میری دین میں وہ دو وقت درختوں روٹیاں پکائی ہوں۔
 ساس میری بھی پیٹک سے ہوں نیچے نہیں دھرتیں۔
 میرے بچے شادی سے پہلے تک میں جھانک کر نہیں
 دیکھا تھا۔ اب جانی میں ہونے کے بعد وہ کہاں کیسے میں
 نہ تو ڈرے گی۔ میں ایک ہفتے صبح سے شام تک کے
 لیے آتی ہوں اور میرے ذریعہ میں نہ بعد جبکہ میری
 چاروں ہاتھوں میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت موجود رہی
 ہے۔ ہاں بچوں سمیت۔ ہم تو مسلمان ہی میں نہیں جانتے
 نہ ہی کوئی ہاتھ پٹانے والا ہوتا ہے۔ آپ سے تو عادتیں
 ہی خراب کی ہوئی ہیں باقی ہوسوگی۔“

”میں نے بھلا کیا کر ڈالا ہے شائد! ہم بھی بس۔۔۔
 چلو اب کہنا کھانوں فضول میں خون جلاتی ہو اپنا۔“
 ”میرا تو کام ہی یہی ہے اسی۔“ ان کا جھجکتا ہوا
 پھر قوت آئیں۔
 ”مہاراجن! اپنے گھر میں بھی خون جلا کر کڑا حق
 ہوں یہاں سکون کے لیے آؤ تو اور صلح خراب ہو جاتا
 ہے آپ کی حالت کچھ کر۔“
 ”مجھے کیا ہوا؟“ اچھی بھلی ہوں۔ تم میری فکر کس
 لیے کرتی ہو۔“

”جی ہوں آپ کی۔ مجھے فکر نہ ہوگی تو کسے ہوگی؟
 یہ وہ کھانے پیتے پھر بھی آپ برابر کچن میں کام کر
 رہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ اپنے آپ کو شرمیلی
 ہیں اور زیادہ مری میں خدا خواستہ چکر اڑ کر بھی ملتی
 ہیں۔“

”ہاں! اگر مری۔۔۔“ بکھرے ہاں اور غل کی بحث
 بے فکر روٹی کے لیے آواز لگائی۔ ان کی نے خیر
 روٹیاں اٹھائیں اور مرے مرے قدموں کے ساتھ

کھانے کی پیٹری کی غرض سے یکن کارو انہ کھولا تو
 سٹک میں پڑے برتن منہ چڑھا کر اعلان کر رہے تھے
 کہ اسی جان نے بنی کو مٹا کر کھانا کھانے پر تیار کر دیا
 تھا۔ ٹھیک ہے وہ جانتی تھیں کہ ان کی نے بھی کھانا
 نہیں کھایا لیکن اگر وہ اسے بھی بلوائیں تو جانے کتنے
 گھٹنے کی محنت خراج جاتی ساری محنت ساجت بے کار
 جاتی۔ بچی کے سامنے ہوسے لکایت کا منظر ہو پھر سے
 ماحول میں تلخی گھول جاتا اور اس تلخی سے بچنے کی خاطر
 انہوں نے تھوڑی سی ڈھنکی مار بھی دی تو کیا ہوا؟

”ہاں! دل کیفیت سمجھنے سے خود بھی قاصر تھی۔ بلکہ
 اپنی بے زاری محسوس کر کے وہ تو ایک دم شہرہ
 تھی۔“
 ”کیا واقعی نکاح کے چند ہول اتنے طاقتور ہوتے
 ہیں کہ یہ ایک رشتہ تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔
 ایک شخص کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آپ کو
 باقی تمام رشتے پس پشت بھی ڈالنے پڑیں تو آپ دروغ
 نہیں کرتے۔“ وہ مسکراتی جاتی اور الجھتی جاتی۔
 ”میں اس کی شادی تو کل اسٹریٹ میں ہو گئی۔“
 ”شادی کے درمیان مختصر سے دوریے میں بھی ان کے
 بائین کوئی شریر سارا رابطہ نہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں بلخ
 بالکل خالی سلیم کی مانند تھے۔“
 ”خالی نہ تھی۔ نہ اس میں نہ اس کے گھڑنے میں۔
 مختصر سی جھلکی۔ ایک شادی شدہ۔ بہن۔ خرم
 خوش اس۔۔۔ وہ منگنی کے بعد ان سرسری معلومات اور
 اشعب کی تصویر دیکھ کر بھی مطمئن تھی، لیکن سارا
 اطمینان رفتہ رفتہ غارت ہونے لگا۔ جب شوہر صاحب
 کی فطرت دان بہ دن کھل کر سامنے آئے۔ وہ حد
 درجہ کلتہ نہیں سمجھتا تھا اس کو ان کی ہر بات پر
 اعتراض تو ہوتا ہی تھا لیکن ان کی جوابات کھلتی ہوئی تھی
 کہ وہ اپنی کتنے چینی کاڑھو وسیع کر کے اس کی ساری
 فیملی کو اپنی پیٹ میں لے لیتا تھا۔

”اس کے بہن بھائیوں کی بکھرے وہ عازلات کے بچے
 ادھر پھرتے ہوئے اسے دینی برابر پر دانت ہوئی کہ اس کی
 کھانے کی پیٹری کی غرض سے یکن کارو انہ کھولا تو
 سٹک میں پڑے برتن منہ چڑھا کر اعلان کر رہے تھے
 کہ اسی جان نے بنی کو مٹا کر کھانا کھانے پر تیار کر دیا
 تھا۔ ٹھیک ہے وہ جانتی تھیں کہ ان کی نے بھی کھانا
 نہیں کھایا لیکن اگر وہ اسے بھی بلوائیں تو جانے کتنے
 گھٹنے کی محنت خراج جاتی ساری محنت ساجت بے کار
 جاتی۔ بچی کے سامنے ہوسے لکایت کا منظر ہو پھر سے
 ماحول میں تلخی گھول جاتا اور اس تلخی سے بچنے کی خاطر
 انہوں نے تھوڑی سی ڈھنکی مار بھی دی تو کیا ہوا؟
 ”ہاں! دل کیفیت سمجھنے سے خود بھی قاصر تھی۔ بلکہ
 اپنی بے زاری محسوس کر کے وہ تو ایک دم شہرہ
 تھی۔“
 ”کیا واقعی نکاح کے چند ہول اتنے طاقتور ہوتے
 ہیں کہ یہ ایک رشتہ تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔
 ایک شخص کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آپ کو
 باقی تمام رشتے پس پشت بھی ڈالنے پڑیں تو آپ دروغ
 نہیں کرتے۔“ وہ مسکراتی جاتی اور الجھتی جاتی۔
 ”میں اس کی شادی تو کل اسٹریٹ میں ہو گئی۔“
 ”شادی کے درمیان مختصر سے دوریے میں بھی ان کے
 بائین کوئی شریر سارا رابطہ نہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں بلخ
 بالکل خالی سلیم کی مانند تھے۔“
 ”خالی نہ تھی۔ نہ اس میں نہ اس کے گھڑنے میں۔
 مختصر سی جھلکی۔ ایک شادی شدہ۔ بہن۔ خرم
 خوش اس۔۔۔ وہ منگنی کے بعد ان سرسری معلومات اور
 اشعب کی تصویر دیکھ کر بھی مطمئن تھی، لیکن سارا
 اطمینان رفتہ رفتہ غارت ہونے لگا۔ جب شوہر صاحب
 کی فطرت دان بہ دن کھل کر سامنے آئے۔ وہ حد
 درجہ کلتہ نہیں سمجھتا تھا اس کو ان کی ہر بات پر
 اعتراض تو ہوتا ہی تھا لیکن ان کی جوابات کھلتی ہوئی تھی
 کہ وہ اپنی کتنے چینی کاڑھو وسیع کر کے اس کی ساری
 فیملی کو اپنی پیٹ میں لے لیتا تھا۔

”اس کے بہن بھائیوں کی بکھرے وہ عازلات کے بچے
 ادھر پھرتے ہوئے اسے دینی برابر پر دانت ہوئی کہ اس کی

ہوئی کے دل میں بھی اپنی بہن کے لیے وہی احساسات ہیں جو وہ اپنی بہن کے لیے رکھتا ہے۔ خود اس کا اپنا حال تو یہ تھا کہ بچا کے ماتھے پر آیا ایک بل اسے الگ بلکہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُن کی زبان بچا کے کسی تکلیف دہ رویے کی بلکی سی شکایت بھی سننے پر وہ قلعی تیار نہ تھا۔

”تم کچھ بھی کہہ لو، ہاں چھکڑیوں سے تم میرے دل سے بچا کی جگہ ختم نہیں کر سکتیں، سمجھیں۔ میں ہر گز ماننے پر تیار نہیں کہ چند گھنٹے پہلے گزارنے والی میری بہن تمہارے خلاف کچھ کر سکتی ہے۔ وہ بے جاری تو اب تمہارے رحم و کرم پر ہے۔ اب ای کی غلطی سے کہ سارا گھر بچے سوچے سمجھے تمہارے حوالے کر دیا پھر بھی تمہارے گھر ختم نہیں ہوتے۔“

وہ سننے سے ہی تو اکڑ گیا تھا جب اس نے بچا کے دھڑکنے کی طرف اس کی توجہ دلائی تھی۔ اس بار تو انہوں نے اُن کی کوئی چیز گرا لانے میں کوئی کسر بھی نہ چھوڑی تھی۔ اسی کے کہنے پر ہی اس نے برائی کے ساتھ چھوٹی کتاب دہی بڑے جھٹکے پھانسی صاحب کھانے کی ٹیبل پر بٹھتی ہی منہ بنانے لگا۔ اسی چلن نے برائی کی دھڑکنے پر برائی تو کہنے لگا۔

”تمہیں آئی! دوسرے کو بھی برائی ہی کھانی تھی۔ شاید تم نے بچا نہیں تھا۔ دن میں دو دو بار ایک ہی تیز میں کھا نہیں سکتا۔“ اسی کے اشارہ کرنے سے پہلے ہی وہ روٹیاں ڈالنے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں یہ کتاب لوچا، بہت لذت دینے والی ہے اور یہ قرانی پتھر تو چھوٹا کتا ہے۔ مسالے بالکل استعمال نہیں ہوتے اس میں۔“ اسی لڑن کی ڈیٹ بھرنے لگیں تو اشعب بہن کی طرف منہ کر کے اسے تولاؤں دیتے لگا۔

”جتنی جلدی کرو۔ جلدی لے کر آؤ روٹی۔“ بلکہ کھانا لٹنے سے پہلے ہی پوچھ لگیں تو خاندان والی کو یوں بیٹھا تو نہ رہا۔

”شکر کرو خیر! یہ بیٹھے ہیں۔“ بچا نے کہا۔ ”شاید سرال کا لالہ ہے گھر میں ہوتے تو ایک منٹ میں نیل

سے اٹھ جاتے۔ کھانے تک اگر روٹی کا انتظار کرنا بہت مشکل لگتا ہے انہیں اسی لیے میں اپنی نوبت ہی نہیں کرتی ہوں۔“

”اب بچا اسب میں دو سوچو، بوجھ تو انہیں سکتی۔“ وہ پڑھایا تھا جیسے تیسے جتنی جلدی اس سے ہو سکا اس نے وہ تین روٹیاں پکا میں اور لے آئی۔ کھائی صاحب فرانکی چلن سے اصراف کر رہے تھے۔ روٹی کے چند گھنٹے کتاب کے ساتھ لیے پھر انہوں نے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”خوب بھی ٹھیک طرح نہ لے سکا تھا اور اسب دور اہل چلن اور کتاب دونوں ہی سے تو اچھے ہیں مگر خشک خشک سے۔“ روٹی حلق میں پھنس رہی ہے۔ چلو خیر۔“ بچا کا رنگ از گیا، پہلے شوہر کی پشت پر لگا ہیں پھر اگر دیکھتے رہیں پھر اسی کی طرف حلوہ کنال نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”دیکھتے ہی۔ ابھی کھار تو یہ آتے ہیں۔ اب چند خشک کاڈیشن بھی نہیں ہوا سکتیں۔“ ”خالد کو برائی پسند ہے اسی لیے جوانی تھی۔ مجھے کیا چاہتا اس نے دوسرے کو بھی لکھی کھانی، جیسے بڑا چاہیے تھا۔“ اسی خود بھی دلاؤ کے اس طرح اٹھ جانے پر جھنجھکی ہوئی تھیں۔

”نہا یہ بھی مجھے چاہا ہے تھا کہ کم از کم ایک تو سامان پکا لیا ہوتا تاکہ چاول نہ کھانے کی صورت میں کوئی روٹی ہی کھا سکے۔“ پانچمب میں یہ سمجھوں کہ اب بچن کا بجٹ آپ کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے اس لیے۔“

”میں یہ بات کی آپ نے بچا۔ اب محض اتفاق ہے۔“ پھر اُن کی لارو والی۔ اب کپڑوں میری محبت پر شک تو نہ کریں۔ کیا آپ کی اس گھر میں خشیت ہونے لگی ہے؟“ اشعب بولکلا کر بہن بہن کرنے لگا۔ اسے سنا

دن اس نے بچا ان کے نازک مزاج شوہر اور بیٹے کی خاطر یہ اراٹ میں ختم ہوئے گزارا۔ ایسے میں اشعب کی لالہ لالہ، اسی کا کچھ بھی سا انداز، بچوں کی افراتفری، شوہر شراپے اور بچا کے کڑے کسبے

انہوں نے مسلسل اس کا موڈ تھک کیے رکھا۔ رات کو اب اس نے اُن کی توجہ اس کے خراب موڈ کی طرف دلائی تو وہ چپ نہ رہ سکی۔

”ایسے میں کوئی ایسے موڈ ٹھیک رکھ سکتا ہے۔ جب ہاں بھر سخت گرمی اور خراب طبیعت کے باوجود سخت صحت کی ہوا اور بجائے چند الفاظ تعریف کے یا حوصلہ دہانی کے سننے کے، صرف تنہید اور طرہ سننے کو ملے۔“

”اب جب بھی بچا کے سامنے آئی مجھے نیکی پکڑا مانتا ہی کرنا پڑا۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے سامنے مجھے کچھ بھی کہہ دیتی ہیں اور آپ کا طرز عمل انہیں شد و دنا ہے۔ میں اگر چپ چاپ سب سن لیتی ہوں تو اسی کو ثابت دیا ہے۔ یہ امید مت رکھیں کہ اپنی انسلٹ اور دل دکھانے والے رویے کے بدلے میں وہاں نہیں اس کے ہاتھ بچھاؤں گی۔“ وہ بے حد جمل کر رہی تھی اور اشعب ٹھٹھا اٹھا تھا۔

”کیسی نیکی گون ہی انسلٹ۔ کیا کہہ دیا تمہیں چاہا ہے۔ تم غلطی کرو لو۔ تمہیں اس کا احساس بھی نہ ملا جائے؟“ یہی چاہتی ہو تم۔ یہ دوج تمہارے گھر اس کا گھر نہیں کہ منہ نہ لگائے۔ کیا اپنی بیکے کی باتیں بھول جاؤ اُن کی حکیمانہ خاندانی لوگ ہیں۔“

”اور ہم۔“ وہ کہتا ہے۔ ”وہ پھر اسی۔“ ”میرے منہ مت لگوس۔“ مجھے اونچی آواز میں پسند ہے نہ بلند لہجے، اپنی اوقات میں رہو تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔“ اس کے سرو لہجے کی سرسراہٹ اور

”اس آکھوں میں ایسی دھمکی تھی جسے محسوس کر کے میں نے سارا طیش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہی کی آخری حد کو پہنچے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ شاید وہ اس شخص سے کبھی محبت نہ کر سکے گی۔ کبھی نہیں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اسے اشعب سے محبت تھی۔ کیوں تھی اس لیے تھی۔ یہ اس کی کھ سے تھی ہر حال۔“

”البا واقعی نکاح کے چند دن اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ محض ایک دھن سے کو بیچانے کے لیے باقی تمام شے پس پشت ڈال دیے جاتے ہیں۔“

اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بے چین ہو کر کمرے میں پھرنے لگی۔ کل صبح ہی وہ اپنی اسی کی طرف رہنے آئی تھی۔ شادی شدہ زندگی کے ان چھ سات ماہ کے دوران یہ دو سرا سوچ تھا جب وہ یوں پسند

دن رہنے کا پروگرام بنا کر گھر سے نکلی تھی۔ کوئی پابندی تو نہ تھی اس پر بس وہ خود ہی کچھ تو اشعب کے رویے سے خائف ہو کر اور کچھ اپنی جان کی تحاشی کا خیال کر کے زیادہ دیر نہ رکھی۔ اسی کو پتا چلا تو خود اصرار کر کے اسے بھیجا اور اپنی طرف سے خوب بے فکر رہنے کی تاکید بھی کی۔ لیکن ایک ہی دن میں وہ گھر مند ہو گئی اور

سوئے سے پہلے اشعب کو فون کر دیا۔ ”بس کل شام آپ مجھے لینے آجائیے گا۔ بجائے اسی کس طرح آپ کی ناشتہ اور کھانا وغیرہ تیار کرتی ہوں گی۔“ اور اس کے اس انداز پر وہ نہال ہی ہو ہو گیا۔ اسی سرشاری میں وہ اس سے خود لینے آئے کا وعدہ بھی کر

بیٹھا حالانکہ سرال چاہا اس کے لیے ایک ناگوار عمل تھا۔ اور اس وقت اس وعدے پر وہ خوش بھی ہوئی لیکن صبح کو اچھے ہی جب اس نے طوطی کی آواز سنی تو بے زاری کی ایک لہر نے اسے پیٹ میں لے لیا۔ ساتھ ہی یہ سوچ اسے سن رہی تھی کہ وہ اپنی بہن اپنی عزیز سہیلی اپنی مل جلنے کے لئے اس طرح کچھ کر رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ اس کے مجازی خدا کو اس کی بہن کی موجودگی پسند نہیں۔ صرف اس کے لئے ہے۔

وہاں حلوہ کے خدشے نے بہتوں بعد ملنے والی بہن کی گھپ دل کو خوش نکھ نہ ہونے والا۔ اسے سخت غصہ تھا۔ اٹھا طوطی کے اچانک آجائے پر کیا تھا جو وہ ایک دن بعد آجائی۔ وہ گھر سے نکلی تھی۔ اشعب انہیں بھانجی نے اندر بھانکا۔

”اے اُن کی باتیں ابھی تک اندر بیٹھی ہو، ہریش لگ چکا ہے اور طوطی بھی کب سے تمہیں پوچھ رہی ہے۔“ ”موندہ پوچھ رہی ہے۔“ اس نے لڑکھ کر سوچا۔

”ان ہی کی حرکتوں کی وجہ سے اشعب بگڑتے ہیں مجھے۔ اب اگر اس وقت وہ بھی یہاں ہوتے تو برا بھی محسوس کرتے کہ طوطی آئی اور سیدھا ناشتے کی میز پر

بڑھتی تھی۔ بھائی کے گھر کے لوگوں سے ملے کہ۔
 "کیا ہو گیا سب کچھ رہی ہو۔ ناشتہ کرو۔" لیکن
 یہ بھی نہ وہاں نہ وہاں نہ گئی۔
 "اگر وہی نہیں بھاگتی، ناشتہ ہی ہے۔ کھانا کھائیں بھائی
 جا رہا ہے؟" اس کے آگے بچے۔ بھائی بھی کے چہرے
 پہ ہر وقت کھلی رہنے والی مسکراہٹ دیکھی پڑتی اور وہ
 چپ چاپ پلٹ گئیں۔ بے دلی سے چل میں جاؤں
 بھڑکتے ہوئے اور مہرے پل پیٹتے ہوئے اسے ان
 کے پیچھے لٹکا ہی رہا۔ طوفانی آواز بھرے پرانے سے
 نیر آواز تھا اسے دیکھ کر کسی سے چھل کر رہی۔
 "بے ایمان۔" اکل کی آواز ہو چکے بنایا تک
 نہیں۔ "وہے ناشتہ ازکی سے لٹ گئی۔
 "وہ تو مجھے نکالنے فون کیا، شکر ہے جنید ابھی گھر پہ
 ہی تھا میں نے جلدی سے بیگ میں کپڑے غولے اور
 نکل آئی۔ عرصہ ہی ہو گیا ہے رات کو اچھے بیٹھ کر
 بھائی کی برائیاں کیے۔" اس نے شرارت سے لیکن
 بھائی کو دیکھا، انہوں نے جانے میں چینی گھولتے
 گھولتے گرم چائے اس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا۔ وہ پھر
 چینی۔
 "دیکھیں ناصر بھیا! آپ کی تیکم مندوں پہ جستانی
 نقد کرنے اتر گئی ہیں۔"
 "بھئی یہ تو حقوق سب اس کا کیس ہے مجھ سے کیا
 کہہ رہی ہو۔" وہ ہاتھ پوجتے اٹھ کھڑے ہوئے۔
 "دیکھو! احمق نے فون پر میرے آنے کی اطلاع تو دے
 دی، طوفانی کو یہ نہیں بتایا کہ میں آج رات وہاں جا رہی
 ہوں۔ خواہ مخواہ اس نے زحمت کی۔" اس کے جانے کی
 بات سن کر طوفانی کانٹہ لگ گیا۔
 "وہی واقعی؟ تم بس ایک رات ہی کے لیے آئی
 تھیں۔ مجھے کیا پتا تھا میں فضول میں اتنے پروگرام
 سیٹ کر کے گھر سے نکل آئی۔ سب تو واقعی تم سے لڑنا
 چاہیے۔ جب تمہیں ایک ہی رات رکتا تھا تو مجھے کل
 ہی فون کر تھیں کہ آؤ تم میں کل شام کو ہی آجائی۔"
 "میں نے تو سوچا تھا لیکن پتا چلا کہ میرے آنے
 سے وہ عین دن پہلے ہی تم پرانی دن رہ کر واپس گئی ہو۔

اس لیے رہنے دیا کہ اب پروڈرڈ کنس گھر میں چھوڑ کر
 نکاوی۔ پہلے کی بات اور بھی اسے تو تیار رہنا اسکول
 جانے لگا جب۔" غلطی تو سادہ سے تھی لیکن طوفانی کو بری
 طرح محسوس ہوئے حالانکہ ٹیسی مذاق میں وہ سب
 بہن بھائی ایک دوسرے کو کافی کچھ کہہ جاتے تھے اور
 ازکی کے انداز میں مذاق کی کوئی نہ مسمی۔ شاید اس
 لیے اس نے اس جملے کو اور طرح سے لیا اور چپ کر
 گئی بلکہ چند منٹ کے لیے سب ہی خاموش سے
 رہے۔ ازکی کو اپنی سرور مری کا احساس ہوا تو وہ شرمندہ
 ہو گئی۔ واقعی کئی ہفتوں بعد ملنے والی بہن کی گرم دوشی
 کے مقابلے میں اس کا رویہ نامناسب تھا لیکن وہ کیا
 کرتی؟ اسے طوفانی سے بھلا کیا شکایت ہوئی تھی وہ تو بس
 دشعب کی موضوع ناراضی کا سوچ سوچ کر الجھ رہی تھی
 اور اسی الجھن میں اس سے ڈھنگ سے بات نہ کر
 سکی۔ اپنی خیالات مٹانے کا اور کوئی طریقہ سمجھ نہ آیا تو
 چائے کا گلاسٹا گرائی کے کمرے میں بھی گئی۔
 شام کو بھائی بھی کی مدد کی غرض سے جن میں کئی طوفانی
 لیکن بھائی کے کانڈھے پہ چھل کچھ کہہ رہی تھی وہ
 بھی تندریش سر ہلا رہی تھیں۔ ازکی نے محسوس کیا کہ
 اسے آنا کچھ کر رہی ہے۔ ناشتہ طوفانی کو متوجہ کیا۔
 "طوفانی آئی! بس آپ رہنے دیجیے۔ میں ازکی آتی
 سے پوچھ گئی ہوں، اڑا نکل پانے کی حرکت۔" اور
 طوفانی نے چونک کر اسے دیکھا تھا بھائی بھی متحیر
 کھڑی ہو گئیں۔
 "ارے آؤ! چائے اور پیوٹی؟" بھائی نے بڑے
 سے دیکھے میں پیچھے ہلاتے ہوئے پوچھا۔
 "میں میں تو پوچھنے آئی تھی کہ اگر کوئی کام ہو تو
 دیجیے۔ میں کچھ مدد کر دوں کھانے کی تیاری میں۔"
 "مختصر کس پوچھا؟ تم نے پوچھ لیا تھا ہی کافی ہے اور
 اس موٹی کوٹ بھو گھنڈ بھرے میرے سر پہ کھڑی ہے
 بجائے ہاتھ پانے کے انرا فریاش کر رہی ہے۔ سارا کام
 چھوڑ کے ابھی اس کے لیے پکڑے تھے ہیں۔"
 "بھئی کبھی تو آپ کو موقع ملتا ہے اپنی کار کردگی
 دکھانے کا اس میں بھی اگر ہم دونوں آپ کا ہاتھ پانے

اسے ابھی تک اشعب کی جیند سے وہ کتنی کی چند
 ملاقاتیں یاد تھیں جن کے بعد دونوں تک اس نے ازکی
 کے کان کھائے تھے اور ہنسی کی باس کے ساتھ حد سے
 بڑھتی بے تکلفی پہ ناگواری کا پڑلا اظہار کیا تھا۔ اسے
 طوفانی کا خود سے انداز کی گناہی باور پھلا لگا تھا۔ یہی وجہ تھی
 کہ ان دونوں کا آج یہاں موجود ہونا اسے بری طرح
 کھل رہا تھا اور وہ اپنے تاثرات کو چھپائے نہ چھپا پار ہی
 تھی۔
 اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، االی کے دروازے میں
 کھڑی ازکی نے دیکھا کہ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے
 کے بعد باہر نکلتے اشعب کے منہ کے زوے کس
 طرح کھڑے لگ گئے تھے۔ ابو کے ساتھ استقبال کو
 کھڑے جنید کو دیکھتے ہی اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ
 واپس چلا جائے۔ بچے دل کے ساتھ وہ چلی اور کمرے
 میں جا کر کھیلے باہل کو برش کے ساتھ سلجھائے لگی۔
 باصر بھائی کی موجودگی میں یوں بھی فی الحال داخل ناگواری
 ہی تھی وہ اشعب سے اس کے برش کے بارے میں
 گفتگو کر رہے تھے جو اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس
 نے بھی شور ہے اسی چوکن کی تحیرت و دریافت کی "تبی
 دیر میں بھائی نے کھانا لگنے کی اطلاع دی اور میں کھانا
 کھا رہے ہوئے ہی اصل مسئلہ پیدا ہوا جب طوفانی اور
 جنید میں حسب معمول ٹوک بھونک شروع ہوئی۔
 جس میں آہستہ آہستہ ابو "باسط" چلی اور لیکن بھائی
 بھی شامل ہوتے گئے وہ ہر لمحے کے ساتھ چور نظروں
 کے ساتھ اسے دیکھتی رہی جس کے چہرے پہ ناگواری
 کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس کی برداشت کی حد تمام
 ہوئی جب جنید نے اپنی جھڑپ میں ازکی اور اشعب کو
 بھی لپٹا لیا۔
 "ازکی! تم کچھ دیر اور رکتا چاہو گی یا میرے ساتھ چلو
 گی؟" اس نے پلٹ پرے کھٹکاتے ہوئے جنید کے
 کسی جملے کو سراسر نظر انداز کر کے سوال کیا۔ وہ کھیا کر
 چپ کر گیا بلکہ اوری اور لیکن بھائی سوالیہ نظروں سے
 اسے دیکھنے لگے۔
 ابو اور باصر بھیا کے چہرے پہ بھی اس کے اچانک

جانے کی بات کرنے پہ حیرانی پھیل گئی جبکہ طوبی آنکھوں ہی آنکھوں میں باسط کو کچھ اشارے کرنے لگی۔ وہ اتنے سارے لوگوں میں بیٹھی سب کے مختلف ردِ عمل کا سوچ کر ہی گھبرا اٹھی۔ اس سے کوئی جواب ہی نہ بن پایا۔

”اگر رکنا ہے تو پھر کل صبح باصر بھیا کے ساتھ آجانا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آکس کریم لا رہی ہوں اشعب! آپ بیٹھیں تو سہی۔“ بھابھی بھی جلدی سے اٹھیں۔

”جی نہیں شکریہ بھابھی! میرا گلا خراب ہے۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

”بیٹا! آپ نے صحیح طرح کھانا بھی نہیں کھایا۔“ امی نے کہا، بھیا اور ابو نے بھی مزید رکنے کے لیے اصرار کیا۔

”آئی! میں نے کھانا کھالیا ہے اور میں ضرور کچھ دیر اور رکنا اگر مجھے ضروری کام نہ ہوتا۔ میرا ایک بہت اہم نوعیت کا فیکس آنے والا ہے جس کا مجھے ارجنٹ جواب دینا ہے۔“ اس نے پتا نہیں بچ بولا تھا یا بہانہ گھڑا تھا، ہر حال وہ خود کو سنبھالتی اٹھی۔

”بس دو منٹ پلینز۔ میں بیگ لے آؤں آپ پہلے کہہ دیتے تو میں نہ صرف خود تیار رہتی بلکہ کھانا بھی جلد لگوا لیتی۔“ اس کے ساتھ جانے پر اشعب کے چہرے سے کچھ تناؤ کم ہوا۔

کار کی فرنٹ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کیا سوچ کر یہاں آئی تھی۔ بلکہ وہ آئی ہی کیوں تھی؟ ان دو دنوں میں نہ وہ خود خوش رہی تھی نہ ہی کسی کو کر سکی تھی اور اب جاتے جاتے بھی وہ گھر بھر کو ایک موضوع دے گئی تھی جس پہ وہ گھنٹوں بحث کرتے رہیں گے۔ اس کا دل یہ سوچ کر بھی سما جا رہا تھا کہ اشعب نجانے کتنے دن تک اس بات کا ماتم کرتا رہے گا کہ بیوی کے کہنے پہ سوچے سمجھے بغیر سسرال یا ترا کے لیے چل پڑا۔ اس کے خاندان کی بد لحاظی اور بد تمیزی کے قصیدے پڑھے جائیں گے۔ آئے گئے کا احترام نہ کرنے پہ افسوس کا اظہار کیا جائے

گا اور شاید اسے وحشت ہونے لگی آنے والے دن کی تلخی کو سوچ سوچ کر۔ وہ فطرتاً خوش باش رہنے والا صبح جو سی لڑکی تھی۔ اتنی ٹینشن میں رہنا اس کے لیے دشوار ترین امر تھا لیکن اس کی حساس فطرت کسی کسی بات کو لے کر افسردہ ہو ہی جاتی تھی۔

”کیا اب ہمیشہ افسردگی کی اس ٹھنڈی چادر کی اُگل میں ہی دن گزارنے پڑیں گے؟“ اس نے دل سے سوال کیا، جواب میں دل زور سے دھڑک کر سکڑ گیا۔ اس نے ایک نظر اشعب کو دیکھا۔ وہ لب بچنے خاموشی کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ساون کی سوندھی سوندھی سی رات تھی۔ کیمپس کی صر کے ساتھ بنی خوبصورت سڑک پہ اس وقت کار سبک رفتاری سے چل رہی تھی۔

شام کی موسلا دھار بارش نے سڑکیں دھو کر جیسے چمکادی تھیں۔ تار کول کی سیاہ چمکتی ہوئی سڑک پہ وہ طرف لگے قد آور درختوں کے سائے عجیب ہیبت ناک سے لگ رہے تھے۔ لاہور شہر رات کے اس پہر پورے آب و تاب کے ساتھ زندہ تھا صرف اس حصے میں ٹریفک کا زور کم تھا۔ اے سی آف کرنے کے بعد اس نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے سرکایا، تازہ فضا میں چند گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے ازکی نے طبیعت کا بو جھل پن دور کرنا چاہا۔ ڈیک آن کرتے ہوئے ایک ناز کے ساتھ گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ آس پاس مٹی بیگم کی آواز پھیل کر اس تنہائی میں ذرا سا ارتعاش پیدا کر گئی۔

”مجھے یاد کیا؟“ وہ چونک پڑا۔ غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں یکسر مختلف تاثرات تھے۔ شانے اچکا کر کہنے لگا۔

”تم کون سا مہینہ بھر رہے گئی تھیں جو یاد کرنے کی نوبت آئی۔“ اگرچہ جواب خاصا حوصلہ شکن تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔

”اچھا۔۔۔“ اس نے جتاتے لہجے میں کہا۔
”تو آپ کو یاد آنے کے لیے مجھے مہینہ بھر غائب رہنا پڑے گا۔ پھر تو میری یہ حسرت حسرت ہی رہے گی

کہ اتنے دن آپ سے دور رہنے کے بعد میں یہ دیکھنے کے قابل ہی کہاں رہوں گی کہ آپ نے مجھے پاؤ کیا یا نہیں۔ اگرچہ اس میں کچھ ایسا جھوٹ یا مبالغہ بھی نہ تھا اس کے بغیر وہ کہاں اتنے دن رہ سکتی تھی۔ لاکھ شکر سی تھا تو مقبوس۔ ہاں البتہ یہ بات بے موقع ضرور تھی اس کا احساس اشعب کو بھی تھا اسی لیے لپکا پہلا سا ہو کر کہنے لگا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا تم ناراض ہو رہی ہو گی۔ میرے اچانک جانے کے فیصلے پر۔“ نہیں محض چھوڑ کر اٹھنا برا۔ اس کے کریدنے انداز پر بے نیازی کا مظاہرہ کرتی بازی سنے لگا۔

”ناراضی کیسی؟ میں نے خود ہی تو فون کر کے کپ کر کہا تھا کہ مجھے لے جائیں۔“ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی عقل اسے محسوس ہی نہ ہوئی ہو۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہو گیا اور وہ بھی تو چاہتی تھی جس بات کو ختم کرنے کے ارادے سے ہی لگاؤ کا یہ مظاہرہ کیا تھا۔ اب یہ امر اس کے لیے کتنا دشوار تھا یہ تو وہی جانتی تھی لیکن اس نے اپنی اندرست فطرت سے یہ کہتے ہوئے رعایت مانگی تھی کہ کم از کم خود ہر کے آگے ذرا سا معاملہ سنبھال لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

گلاڑی ”عمر میں ڈیلا نہیں“ کے آگے مکی تو اس نے سواٹھ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم نے آس کریم نہیں کھائی؟“ میں نے سوچا کہ لگے نہ رہ جائے۔ ”آرڈر دیتے ہوئے اس نے تو جیسرہ چشم کی تو ازکی مشکل سے اپنی جیسی ضبط کر پائی۔ (داد صاحب نیار بھی بنائیں گے تو لاڑا ہم دے کر)۔

ایک بار مسکرا دیا۔

ایک بار مسکرا دیا۔

میں ٹیکم نے تو پچھلے کس سے فرمائش کی تھی۔ لیکن وہ جذبے لٹائی نظروں کے ساتھ ایک بار بھری مکان کی میں لیے اسے نکلے گی۔ اسے اپنے تڑپے پہ اس کی نظروں کی پیش محسوس تو ہو رہی تھی لیکن بے نیاز بنا ڈرا نہ کر رہا۔ گیت ختم ہوا تو اس نے

دروازہ کھل کر کے پھر سے لگایا۔

ایک بار مسکرا دیا۔

اب کے کوچ ہو کر اشعب نے اسے گھور لیا۔ اس کی شرارت محسوس کر کے وہ غصہ کیا۔ ازکی نے ہولے سے سر کو ٹٹائی۔

”ہیں ایک بار بس۔“

اس کی آنکھوں میں حمیم حیرت نظر آیا، ڈارک براؤن موچلوں کے تلے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے کو تھی کہ اس نے جتنی سے لب بلی کر کار کی اسپیڈ برعادی۔ ازکی کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ جتنی کو مشغل کر سکتی تھی ہر کچھ بھی بلکہ اب اسے غصہ آنے لگا خود پر۔

”کیا ضرورت تھی مجھے ڈو کو اس قدر کرائے کی اور سرچلہ جائیں گے حضرت کہ بوی تو دل جان سے ذرا بے عاشق ہے پوری۔ جو مرضی گئے کرتے رہو۔ عمر و مسکراہٹ۔“ آنکھوں سے ایوں تنک آنا ہوا سا محترمہ بھلا نہ سکی۔

♥ ♥ ♥ ♥

”کیا بات ہے ازکی؟ تم کچھ روز سے ابھی ابھی نظر آ رہی ہو۔“ اسی جان نے بڑے ہی پیار سے پوچھا۔

”اسی کو تو کی بات نہیں مای! آپ کو ہم ہوا ہے۔“

”ہو ہم تو نہیں ہوا ہاں اگر تم پچھتاؤ چاہو تو وہ دوسری بات ہے۔“

”جی کی اس بات۔ وہ جڑیں ہو کے رہ گئی۔“

”جب سے تم اپنی اسی گھر رہ کے آئی ہو نہیں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے اور اشعب بہت بھی کچھ سمجھتی ہی ہو۔ کسی بات پر کوئی جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟“

”جھگڑا کیا ہوئے اسی جان۔ بس اب میں تھک گئی

ہوں۔ مدت مارنے لگی ہوں۔ میں نے سوچا تھا محبت اپنی جگہ قائم ہے لیکن۔“

اسے اپنے بے سادست پن کے جواب میں اس کا نظریں چڑھتا پھر سے یاد آ گیا اور وہ سمجھ گئی۔ اس رات کے بعد اس نے اشعب کو متوجہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی وہ حقیقتاً اس کے رویے سے سخت مایوس

ہوئی تھی۔

”بنا مجھے چاہو جان! اگر اشعب سے کوئی شکایت اس کی غلطی ہوئی تو میں خوب کھن کھنچوں گی اس کے کہ میری اتنی اچھی بیٹی کو ناراض کیوں کیا؟“ وہی ہاں نے پیار سے لاڈ سے ہلکا کر اسے بولنے پہ آمادہ کر دیا تھا۔

”میں نہیں جانتی وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ انہیں اب سب کا ہنسا ہوتا مذاق کرنا سب کچھ برا لگتا ہے۔“ اور جان بگڑا ہے۔ میں اپنے من بھانسیں سے کٹ کر انہیں رو سکتی اور ظاہر ہے میرے حوالے سے اشعب کا بھی من سے ملتا رہے گا جو کیا ساری عمر میں اسی طرح دل بو جھل کیے پھروں گی ان سے ملاقات کے بعد۔“ ساری بات انہیں بتانے کے بعد وہ سوال کر دیا تھی۔ انہوں نے اس کی بات غور سے سنی تھی۔

”آپ ہی بتائیے اسی جان! ان کا طرز عمل درست ہے یا غلط؟ اگر وہ میرے میکے والوں سے کھلتا ملتا نہیں پاتے تو یہ من کی مرضی ہے۔ ٹھیک ہے بعض مریضوں کی ایسی ہی عادت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اپنے اصول و مریضوں پر بھی لاگو کریں۔“ ”جیسے ہسپتال کی عیادت بھائی کی خوش مزاجی پر انہیں اعتراض ہے ہر وقت ان کی بے تکلفی پر تنقید کرتے رہتے ہیں نہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جیسے بھائی میرے لپا زانو ہیں۔ ہم لوگ ایک ساتھ کئی سال گزار چکے ہیں۔ انہیں سے اکتھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر میں ایک جگہ جا چکے ہیں ان کا ہمارا رشتہ محض سالی سہنوی والا نہیں ہے پھر انہیں میری بہنوں کی ہر عادت میں کڑے نگاہ لگنے کا قیاس ہے اور تو اور وہ میرے سامنے ہی میرے ابو اور اسی کی تربیت پر کڑی تنقید کرنے سے ہی نہیں چوکتے کیا یہ سب برداشت کرنا میرے لیے اول آسان بات ہے؟ پھر بھی میں نے یہ سب برداشت کر کے انہیں ہی خوش رکھنا چاہا۔ ایک بار بھی انہیں ان کے بد صورت رویے کا احساس نہ دلایا۔“ ”مگر وہ ہیں کہ۔۔۔“

جھجک اور خرم کے بارے وہ اپنی بات پوری نہ کر

سکی کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ آپ کا بیٹا ایسا پتھر ہے جس پر میری محبت کی پھوار بھی شکاف نہ ڈال سکی۔

”مجھے خدشہ تو تھا کہ اشعب یہ سارے رنگ ڈھنگ کبھی نہ بھی ضرور اپنائے گا لیکن یہ امید نہ تھی کہ تمہارے جیسی ہیرو پھولی ہانے کے بعد بھی اس کی طبیعت کی تلخی دور نہ ہو سکے گی۔ میں نے تو بڑی چھان پچھان کے بعد تمہارا انتخاب کیا تھا۔ نہ صرف تم بلکہ تمہارا پورا گھرانہ ہی مجھے بڑا پھلا لگا تھا۔ ہنستا مسکراتا صاف دل کا۔ میں نے سوچا تھا میرے بیٹے کے دل میں بھی کھیاں چٹکے نکلیں گی لیکن جتنے برسوں نے جو زچر اس کے اندر بھر دیا ہے شاید اتنی جلدی اس کا اثر زائل نہ ہو سکے گا۔“

”کیسا زچر؟“ وہ پوچھی۔

”اب تم سے کیا چھپا بیٹی! آج تم اپنا ہونک مجھ سے بیان کر رہی ہو یہ اس کا دس فیصد حصہ بھی نہیں ہو کچھ میں نے بھلا۔ میں ایک درمیانے درجے کے ایماندار سرکاری ملازم کی بیٹی تھی ہمارا کل انڈسٹریز اور تعلیم ہی تھا۔ ایسے میں جب میں ہوا کر لمبی چوڑی سسرال لٹی تو وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کے بولا گئی اور بولھلا کے تو وہ سب بھی مد کے جب ان چٹان پڑھ لوگوں کے درمیان ایک لی ڈی ہو آئی۔ میرے شوہر ہوں تو تعلیم یافتہ ہی تھے لیکن خاندانی جمالت ان کی رگوں تک میں گردش کر رہی تھی وہ ان مریضوں میں سے تھے جن کی ڈوریاں من کی ماؤں بہنوں کی انگلیوں میں پھنسی ہوئی ہیں اور ان کی مائیں بہنیں۔ وہ میری تعلیم میرے سمجھنے پرے اور میرے طور طریقوں سے خائف تھیں۔“

اب لیے قہے کیا سناؤں بس اتنا کافی ہے کہ ہر ممکن طریقے سے انہوں نے مجھے دانے کی کوشش کی تاکہ میں ان پر حاوی نہ ہو جاؤں میرا سلیقہ ان کے آچرین کو اور نمایاں نہ کر دے اس لیے انہوں نے مجھے بھی ابھرنے نہ دیا۔ سسرال میں گزارے اٹھارہ سال میرے لیے کسی پردیس میں کسی اجنبی سرزمین میں ذخیر سارے ناشائساؤں کے درمیان گزرے تکلیف

وہ سال تھے۔ سونے پہ سہاگہ اس عرصے میں ان کا کاروبار خوب چمکا۔ دولت کی ریل پیل ہو گئی، جہالت اور دولت جب یکجا ہو جائیں تو بڑی تکلیف دہ چیز بن جاتی ہے۔ وہ پہلے ہی ناقابل برداشت تھے اور بھی اذیت دینے لگے۔ میرے ہنسنے بولنے ہر چیز پہ پابندی تھی۔ میرے شوہر نے بہنوں کو ہر طرح کی آزادی اور سہولت دے رکھی تھی، کیونکہ ان کے نزدیک وہ معصوم تھیں جبکہ میں کالج کا منہ دیکھ چکی تھی۔ کتابیں رڑھ چکی تھی میرے بگڑنے کا اندیشہ زیادہ تھا اس لیے ٹکڑی ہابندیاں صرف میرے لیے تھیں۔

نری پابندیاں سرت سیرت سے یہاں سے یہاں سے
اتنے بڑے سارے کنبے کی ہر ذمہ داری اکیلی مجھ پہ
تھی۔ کیونکہ بقول میری ساس کے میں تیز گھرانے کی
نئے زمانے کی لڑکی تھی اور دولت کی فراوانی مجھے
خطرناک بنا سکتی تھی۔ مجھے سر اٹھانے کی فرصت نہ
تھی، بچے کیا پالتی۔ ادھر ادھر دادی اور پھوپھیوں کے
ہاتھوں میں پلتے رہے۔ ان ہی کے خیالات کے بیچ
ذہن میں پوتے رہے۔ مجھے اس گھر سے آزادی یوں ہی
نہیں ملی تھی ازکی۔۔۔ ان کا گلارہ بندھ گیا۔

”بدلے میں مجھے اپنی بیٹی کی قربانی دینا پڑی۔ میری بڑی نیند نے جب شانہ کا رشتہ مانگا تو وہ بس سترہ ہی سال کی تھی اس نے میٹرک میں پڑے اچھے نمبر لیے تھے میں اسے آگے پڑھانا چاہتی تھی لیکن سارا خاندان ایک طرف ہو گیا اور میں اکیلی۔ میری پہلے کسی نے کب سنی تھی جواب کوئی سنتا۔ باپ نے بڑے مان سے اکلوتی بیٹی بہن کے حوالے کر دی اور یہ مان ٹوٹا تو ان کے جینے کی ڈوری بھی ٹوٹ گئی۔ میں اس گھر سے نکل کر بھی جیسے اسی سڑا میں ہوں۔ سگی پھوپھی کا گھر شانہ کے لیے وہی پردیس ثابت ہوا جو اس کی ماں کے لیے تھا۔

یہ تھا۔
حامد نے وہی رنگ ڈھنگ اپنا لیے جو اس کے
خاندان کے مردوں کا وتیرہ ہیں اور۔۔۔ شعب بھی کسی
غیر خاندان کا تو نہیں۔۔۔ اس کی رگوں میں بھی باپ دادا
کا خون ہے۔۔۔ گھٹی میں وہی عادات پڑی ہیں۔۔۔ فرق
صرف یہ پڑا ہے کہ ان کی بری عادات کو خمیر کرنے

میں ان کی ماؤں کا بڑا ہاتھ رہا ہے جبکہ اشعب کی خصلت پروان چڑھانے میں اس کی ماں اور بہن سے کی گئی زیادتیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ جیسا ڈراسہما اس کا بچپن گزرا ہے۔۔۔ وہ اب کسی کو ہستے بولتے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ خوش باش گھرانہ اس کے جذبہ حسد کو ہوا دیتا ہے۔ اس کی ماں سدا باپ کی ٹھوکروں کی زد پر رہی، بہن کو بہنوئی، جوتی کی نوک پہ رکھتا ہے پھر کیوں کوئی اور عورت کوئی سکھ اٹھائے۔ چاہے وہ اس کی اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ بس یہی سوچ اسے برباد کر رہی ہے۔ شانہ کے برتاؤ میں جو لکھی ہے اس کا سبب بھی اس کے ذاتی گھریلو حالات ہیں ورنہ وہ دل کی بُری نہیں ہے بیٹا۔۔۔! میں مانتی ہوں کبھی کبھی وہ تمہارے ساتھ زیادتی کر جاتی ہے لیکن اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ اپنے گھر سے وہ اتنی جلی بھنی آتی ہے کہ تمہیں میرے ساتھ ہستے بستے دیکھنا اسے اور مشتعل کر دیتا ہے۔۔۔“

”یہ کیا بات ہوئی امی جان! اس سارے میں بھلا میرا کیا تصور نکلتا ہے؟ ٹھیک ہے کہ آپ نے ایک مشکل دور گزار اور آپ کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا شعب نے ایک بیٹے کی حیثیت سے بہت اثر لیا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ان سب کا بدلہ مجھ سے لیں اور شبانہ بچیا کے سسرال والوں کا رویہ اگر ان کے ساتھ برا ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے میکے میں اپنی ماں اور بھابھی کے درمیان بھی ایسے ہی تعلقات دیکھنا چاہتیں۔“ اس نے امی جان کی بات سن تو لی تھی اور اسے حقیقتاً ”خاصا افسوس“ بھی ہوا تھا ان کے ماضی کی تلخ یادوں کا ذکر جان کر، لیکن یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ ان تمام حقائق کے پس منظر میں بچیا اور شعب اپنے رویے میں حق بجانب کیسے ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

ہیں۔ ”بھوتا ہے بیٹا! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ زندگی بڑا کچھ سکھاتی ہے، اچھا بھی اور برا بھی۔ یہ تو لینے والے پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کے کسی کسے واقعے کا کیا اثر لیتا ہے۔ اچھا یا برا؟ میری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی نہ ہی

میری اولاد کی فطرت میں کھوٹ ہے یہ تو سب ماحول کا اثر ہے میری بیٹی! جو کچھ یہ میرے ساتھ ہوتا دیکھتے آئے ہیں، سمجھتے ہیں وہی سب لوٹا دینے سے ہی حساب برابر ہو گا۔“

ازکی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی اور بہت کچھ کہہ بھی سکتی تھی۔ لیکن چپ ہی رہی۔ اس نے لبوں پر مہر لگاتے ہوئے اس لا حاصل بحث کو سمیٹ تو دیا لیکن اپنے دل و دماغ میں ابھرتے سوالوں پہ بند نہ باندھ سکی۔

”بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ چونکہ میرے ساتھ برا ہوا اس لیے میں دوسروں کے ساتھ بھی برا ہی کروں گی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔“

اس کی سوچ باغیانہ ہوتی جا رہی تھی ویسے بھی آج کل اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ پرگینشی۔ کا آغاز ہی تھا اور وہ حد سے زیادہ زور دینے لگی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کو بری طرح محسوس کرتی۔ بجیا کی آمد اب اسے پہلے سے کہیں زیادہ چھنے لگی اور تو اور امی جان کا لگاؤ اور پیار بھی اسے مطمئن نہ کر پاتا۔

”کیا فائدہ اس پیار کا۔۔۔ وہ مجھے اپنی اولاد کے برابر تو نہیں چاہ سکتیں۔ تجھے بیٹی کا درجہ تو نہیں دیتیں۔ آخر ہو ہی ہوں اور ہو سے پیار کا کیا مطلب؟“

اب اس کا دل میکے میں بھی نہ لگتا تھا گھر سے گھبرا جاتی تو وہاں کی راہ لیتی لیکن امی اور بھالی کے سوال اتنا زچ کر ڈالتے کہ چند گھنٹوں بعد ہی واپسی کا ارادہ پکا ہو جاتا۔ یوں بھی اسے لگتا کہ جیسے شادی کے بعد وہ امی، ابو، بھیا سب سے دور ہو گئی ہے۔ ذہنی طور پر بھی اور جذباتی طور پر بھی حالانکہ طو بی کی شادی کو اتنے برس بیت چکے تھے لیکن اب بھی وہ میکے میں اسی طرح رچی بسی ہوئی تھی۔ شاید اس کی وجہ چند تھا جس نے اپنے ماں باپ اور ساس سر میں کبھی کوئی فرق نہ سمجھا تھا۔

اس دن بھی بجیا کو گئے ابھی دو ہی روز ہوئے تھے کہ ان کا فون آگیا۔ رمشا کی پانچویں برتھ ڈے تھی۔ سب کو آنے کی دعوت دی گئی وہ چڑ گئی بجیا کے گھر جانے کا

پچھلا کوئی واقعہ خوشگوار نہ تھا۔ شادی کے بعد جب وہ پہلی بار گئی تو چائے کے ساتھ بس معمول کی چیزیں رکھ دی گئیں۔ بسکٹ، نمکو وغیرہ وہ نئی دلہن ہونے کے ناتے جس پذیرائی کی توقع کر رہی تھی وہ اسے نہ ملی۔ بجیا نے سرد سے انداز میں اس کا تعارف اپنی منندوں اور دیورانیوں سے کرایا اور رکنے پہ رسمی سا اصرار بھی نہ کیا۔ دوسری بار وہ میلاوہ گئی بجیا اپنی سسرالی عزیز خواتین کے ارد گرد ہی گھومتی رہیں۔ اسے ایک بار بھی نہ پوچھا تب بھی وہ ہرٹ ہوئی تھی بلکہ اسے سخت بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔ تیسری بار آخری روزے کی شام کو عیدی دینے گئی تھی۔ بجیا نے اپنی منندوں کے لیے افطار پارٹی کا انتظام کیا تھا اور انہیں فکر تھی کہ اشعب اور ازکی جلد از جلد سلمان دے کر چلتے بنیں، اس دن تو اس کی اشعب سے ہلکی پھلکی جھڑپ بھی ہوئی تھی اور اس نے آئندہ ان کے گھر نہ جانے کا اعلان بھی کیا تھا۔

اب پھر سے اتنے لوگوں کے درمیان اسے تماشنا منظور نہ تھا۔ وہ نہ تو ماں کے شایان شان استقبال کرتی تھیں نہ ہی بھائی اور بھانج کو لفٹ دیتی تھیں اور بھالی ہیں کہ عزت نفس نام کو نہیں دقت نہ ہونے کے باوجود بسن کے بلانے پہ بھاگے جائیں گے۔

”ساری اکڑ فون اور رعب داب بس بیوی اور سسرال کے لیے ہے۔“ بے حد تنفر سے اس نے سوچا اور بجیا کی بیٹی کی برتھ ڈے پارٹی گول کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے امی کے گھر کے ممبر پس کرنے لگی۔

”ہیلو۔۔۔“
”ہیلو باسط! میں ازکی بول رہی ہوں۔“
”آہ! ازکی آپ! آپ نے کیسے خود فون کر لیا۔“
”مجھے امی سے ضروری بات کرنی تھی، پلیز ذرا جلدی بلاؤ۔“

”امی تو پڑوس میں گئی ہیں شاید نصرت آنٹی کی طرف۔ آپ ہولڈ کریں گی تو میں بس ایک منٹ میں بلا لاتا ہوں یا پھر آپ کچھ دیر بعد کر لیجئے۔“ اس نے چند لمحے سوچا پھر سہولت سے فون نزدیک کر کے صوفے پہ

بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں ہولڈ کرتی ہوں تم بلا لاؤ۔ بھاگ کے جانا میرے بھائی!“

”جناب میں یوں گیا اور یوں آیا۔“

وہ ریسپور کان سے لگائے ٹیبل پر بڑے اخبار کی ورق گردانی کرنے لگی ابھی چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ کسی کے تیز تیز پونے کی آواز ابھری۔ وہ پل میں پہچان گئی یہ طوبی ہی تھی۔

”اوفوہ جب بھی جانے کا پروگرام بناؤ یہ محترمہ پہلے سے موجود ہوئی ہیں۔ اب تو میں کوئی بھی بہانا بناؤں اشعب نہیں مانیں گے۔ وہ تو یہی سمجھیں گے کہ طوبی کی وجہ سے میں میکے جانے کے لیے چل رہی ہوں جب کہ میں نے سوچا تھا امی سے کہہ کر فون کرواؤں گی کہ آج مجھے چیک اپ کے لیے انہوں نے ڈاکٹر کی طرف لے جانا ہے۔ آرام سے بات بن جاتی لیکن طوبی کی پہلے سے موجودگی سے وہ کھٹک جائیں گے۔ اتنا تو چڑتے ہیں اس سے اور جنید بھائی سے۔“ وہ سارے پروگرام کو غارت جاتے دیکھ کر افسوس سے سر ہلا رہی تھی۔ شاید چپکے سے ریسپور رکھ دیتی اگر طوبی کا جملہ اسے چونکا نہ دیتا۔

”اور سناؤ تجلی ابوہ تمہاری نئی سڑیل بنی آپنی آپنی یا نہیں۔“ اشارہ یقیناً اس کی طرف تھا اس نے کان کھڑے کر لیے۔

”شکر ہے اس ہفتے آمد نہیں ہوئی۔“ تجلی کی بیزار سی آواز سن کر بھی وہ یقین نہ کر پائی کہ یہ وہی اس کی منی سی بہن ہے جو کبھی آپنی آپنی کہتے پیچھے پھرتی تھی۔ وہ مزید کہہ رہی تھی۔

”اللہ آپنی! آپ آتی ہیں نا تو کتنا مزا آتا ہے خوب گپ شپ کرتے ہیں، مووی دیکھتے ہیں، آؤٹنگ کے لیے جاتے ہیں اور ایک ازکی آپنی ہیں وہ آمیں تو ہمارے بنے بنائے پروگرام بھی ٹھس ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی جو ساتھ میں اشعب بھائی ہوں، اف تو بہ۔ آپنی کا بس نہیں چلتا ہمیں مجسمہ بنا کر کونے میں کھڑا کر دیں۔ بھلا ان کے شوہر نہ ہوئے کسی انکسپشن ٹیم کے لیڈر

ہو گئے۔ زور سے مت یولو، قہقہہ مت لگاؤ۔ دوپٹہ طریقے سے لو، یہ کرو۔ وہ کرفس جان مصیبت میں آجاتی ہے۔ بھا بھا بھی بڑی تنگ آئی ہوئی ہیں آج کل ان سے۔ پرسوں بھی بھیا سے کھٹ پٹ ہوئی تھی۔“ آخری جملہ اس نے بڑی رازداری سے کہا۔ ساتھ ہی امی کی آواز آئی۔ وہ طوبی سے ملے ہوئے بتا رہی تھیں کہ پڑوس کے لیے نکلتے ہوئے انہوں نے اس کی کار پورچ میں داخل ہوتے دیکھی اور وہیں سے پلٹ آئیں۔

”امی! یہ تجلی کیا بتا رہی ہیں، ازکی کی وجہ سے بھیا اور بھالی میں کچھ اس نے چھوٹے ہی سوال کیا جس کا جواب جاننے کی وہ بھی منتظر تھی۔

”کیا بتاؤں، قصور تو سارا ازکی کا بھی نہیں۔ وہ بے چاری کیا کرے، اپنے گھر سے جلی بھنی آتی ہے۔ ایمن اس کی مجبوری سمجھنے کے بجائے الٹا برا مان جاتی ہے کہ اس کے آنے سے گھر میں ٹینشن پھیلتی ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ امی کچھ تو انصاف کی بات کریں۔ غلطی اس کی ہے، اپنے گھر کی ٹینشن اپنے گھر تک رکھا کرے۔ بھالی بری ہوئیں تو اب اپنی برائی ظاہر کرتیں، میری شادی کو اتنے سال ہو گئے اور میرا تو زیادہ وقت یہاں گزرتا ہے، کبھی تنگ ہوئی ہیں وہ۔ اور کیوں ہوتی، ہنستے ہنستے آتے ہیں ہم اور بغیر کسی پہ بوجھ بنے، کوئی شکایت کا موقع دیے، ہنستے ہنستے ہی واپس جاتے ہیں۔ اس کا تو جب دیکھو منہ سو جا رہتا ہے۔ ایک تو میاں بھی اکڑو ہے خود بھی ایسی ہو گئی ہے۔“

”کیسے سمجھاؤں اسے، چلو میں تو ماں ہوں، وہ پرانی ہے۔ لاکھ اچھی سہی رشتہ تو بھانج کا ہے، کتنا سہہ سکتی ہے۔ یہ تو اسے بھی پھر کی بنا دیتی ہے اور میاں کو آنا ہو تو دسترخوان کا آرڈر دے دیتی ہے۔ یہ بناؤ وہ بناؤ، اشعب گائے کا گوشت نہیں کھاتے، گلنگ آکل سے ہیک آتی ہے، گھی ڈالیں، سویٹ ڈش ضرور بنائیں، شور بے والا سالن انہیں پسند نہیں۔ اور زیادہ غصہ اسے تب آتا ہے جب میاں کے آنے پر اس کے بچوں کو کمرے تک محدود کر دیتی ہے۔ بچے شرارتیں

کرتے ہی ہیں، انہیں ان کے گھر میں ہی قید کر دینا کوئی عقل مندی کی بات ہے۔“ امی کو بھی اس سے اتنی شکایتیں تھیں وہ سن رہ گئی۔

”نجانے کیوں ایسی ہو گئی ہے وہ؟ بہن تک کو نہیں برداشت کر سکتی۔ میں کوئی بچی تو نہیں، اچھی طرح پہچانتی ہوں اس کے چہرے کے بگڑتے زاویے مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ بن جاتا ہے۔ بھی تمہارا میکہ ہے تو میرا بھی میکہ ہے۔ جتنا تمہارا حق اتنا میرا بھی ہے۔ کیا یہاں آنے کے لیے اب اس کا منہ دیکھوں۔“

”اور خود تو آ جاتی ہیں ہمیں کبھی جھوٹے منہ نہیں کہا آنے کے لیے۔ ایک آدھ بار گئے بھی تو سخت شرمندگی ہوئی۔ ان کا بس نہ چل رہا تھا ہمیں فوراً چلتا کر دیں۔“ بچی نے شکایت کی تو امی نے گھر کا۔

”تم چپ رہو تاجی! بیوں میں نہیں بولتے۔“

”کمال ہے امی! آپ یہاں بیٹھی ہیں اور میں آپ کو کہاں کہاں ڈھونڈ۔۔۔“ باسط کی آواز پہ اس کے پتھرائے اعصاب میں ارتعاش پیدا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ انہیں اس کے فون کے بارے میں بتاتا اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔



”اگر بچیا کو سسرال اچھی نہیں ملی تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں کیا بے جان چیز ہوں جسے پیچ پھانچ کے وہ اپنا غصہ نکالیں گی۔“

اسے اپنا سوال یاد آیا۔ اور فریاد بھی۔

”آپ ہی انصاف کیجئے امی جان! کیا یہ درست ہے؟“

”کچھ تو انصاف کی بات کیجئے امی! اس کی آواز میں طوبی کی آواز شامل ہوئی اور اس پہ آگئی کے تمام دروا کر گئی۔ اور اک کا یہ لمحہ اس کی سوچ کے تمام زاویے بدل گیا۔

لا شعوری طور پہ وہ ان تمام رویوں کی مرتکب ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ بچیا سے شاکر رہی۔ اب اسے اپنے گھر میں بھائی اور بھانج کی پذیرائی کرنے سے اجتناب کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اسے حیرت ہونے

لگی اس وقت یہ نکتہ اس کے دماغ میں روشن کیوں نہیں ہوا جب بھالی اور بچی شاپنگ کے بعد اس سے ملنے چلے آئے تھے اور کمرے میں موجود اشعب نے جھنجھلا کر ریموٹ پھینکتے ہوئے کہا تھا۔

”مارکیٹ کے قریب گھر ہونے کا مطلب یہ نہیں، اب اس جگہ کو ریٹ پوائنٹ سمجھ لیا جائے اور شاپنگ کے بعد سستانے کے لیے یہاں ڈیرے ڈالے جائیں۔“

تب دل ہی دل میں آنسو بہاتے اس نے کس بے دردی کے ساتھ چہرے پہ ناگواری کے تاثرات سجا کے ان سے روکھی پھکی چار باتیں کی تھیں اور بھالی نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔ اور اسے اپنی شاپنگ دیکھائے بغیر ہی واپس چلی گئی تھیں۔ وہ کیوں بھول گئی تھی وہ تو بس صرف شوہر کی ناپسندیدگی سے بچنے کے لیے میکے والوں کے لیے راہ ہموار نہیں رہنے دیتی تھی تو بچیا تو بھرے سسرال میں رہتی تھیں، جہاں ایک سے ایک نکتہ چین موجود تھا۔ کیا مجھے نظر انداز کرتے ہوئے ان کو بھی یونہی اپنا دل مسلنا پڑتا ہو گا۔

”یہ کرسے وہ کرسے یہ پکاؤ۔۔۔ وہ نہ پکاؤ۔۔۔“

بچی کی بات پہ اسے یاد آیا۔ اس کے کہنے پہ وہ بارے باندھے ان کے شوہر کی خاطر مہارت کرتی تھیں لیکن دل ہی دل میں ہزار صلواتیں سناتے ہوئے۔ کیا بھالی کی طرف سے بچیا کو بھی بس وہی ایک بات سننے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔

”تمہارے گھر والوں میں خاندانی لوگوں کے رکھ رکھاؤ نہیں۔ نہ کوئی طریقہ نہ سلیقہ نجانے کیوں جاتی ہو وہاں اور ساتھ مجھے بھی ذلیل کرانے گھسیٹ لیتی ہو۔ کوئی منہ تک تو نہیں لگاتا تمہیں۔“

اسے آج وہ خود اور بچیا ایک ہی کشتی کے سوار لگ رہے تھے۔ جن کے تمام تر حوصلے ناکالی پڑ رہے ہوں اپنی بقا کے لیے۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی جب خود کو بچانہ پارے ہوں تو سہارے کے لیے کسی رشتے کا دامن تھام لینا پڑ گیا ہو۔

”ان میں اگر صلاحیت ہے تو خود شوہر کو قابو کریں۔“

بھائی اور ماں کے رشتے کیوں تلاشتی ہیں۔“

اپنا یہ دعوہ اسے کھوکھلا سا لگا۔

”خود میں کیا ہوں؟ اتنی ہی کمزور اتنی ہی بودی۔ شوہر کو خوش رکھنے کے جتن میں باقی سب کو ناراض کر بیٹھتی ہوں۔ اگر میرا کوئی قصور نہیں تو پھر بجایا بھی بے قصور ہیں۔ اگر میں حق بجانب ہوں تو وہ بھی اور اگر وہ خود کو اپنی گھر ہستی کو بچانے کی خاطر میرا استحصال کر رہی ہیں تو پھر غلط تو میں بھی ہوں۔ مجھے کم از کم کوئی ایک غلطی تو سدھارنی ہے۔“ اس نے ارادہ کیا۔

”مجھے بغیر کسی سہارے کے، کسی کے کاندھے پر چڑھے بغیر محض اپنے بل بوتے پر۔ اپنا مقام بنانا ہے اور ایسا میں صرف اپنے لیے نہیں کروں گی۔ اور شاید اشعب کو بھی بدل دوں۔“

اسے آنکھوں سے سرک کر لبوں کے گوشوں میں سمیٹتی وہ مسکراہٹ یاد تھی۔ نرم مسکراہٹ جو شاید رستہ بھول گئی ہے۔

”میں اس مسکراہٹ کا ہاتھ تھام کے اسے پھر سے اس جگہ سجا دوں گی، جہاں ابھرنے کا وہ راستہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔“



اشعب اپنا والٹ لینے کمرے میں داخل ہوا، حسب عادت دروازہ کھولتے ہی بولنا شروع ہو گیا۔

”ہری اب پہلے ہی دیر ہو گئی، راستے میں کیک اور مٹھائی وغیرہ بھی لینا ہے۔ تمہاری تیاری اس قدر طویل۔“

اس پر نظر پڑتے ہی وہ سب بھول گیا۔ شادی کے اولین چند دنوں میں وہ اسی طرح تیار ہوتی تھی لیکن آج کل تو اس پر روپ ویسے بھی ٹوٹ کر برس رہا تھا امی کہتی تھیں کہ بڑی بختاور ہوتی ہیں وہ عورتیں، ماں بننے کے مرحلے میں جن کے چہرے پہ چاند ستارے اتر آتے ہیں۔

آج تو اس کی جج دھج ہی نزالی تھی۔ شیفون کے کرتا دوپٹے پہ نازک سی سلور سیلیس بنی ہوئی تھیں۔ جدید تراش کی سادہ شلوار اور بغیر ہیل کے سلور سینڈل

لبے بال خوبصورت اشاکل میں سنوارے ہوئے تھے۔ چہرے کے اطراف میں کچھ لٹیں یونہی چھوڑ دی گئی تھیں۔ ہیرے کی لونگ اور بھاری جھمکے چہرے کو جگمگا رہے تھے ورنہ میک اپ ٹولائٹ سا ہی تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟“ نظریں چراتے ہوئے اس نے ایک آوارہ لٹ کو ہاتھ سے پیچھے کیا۔ چوڑیوں کی بدھرجھنکار بکھر گئی۔

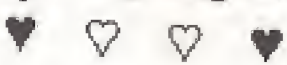
”کچھ نہیں، میں تو بس۔۔۔ وہ تم نے پہلے ساڑھی نکالی تھی۔“

”جی لیکن امی کا کہنا ہے اس حالت میں ساڑھی پہننا میرے لیے مناسب نہیں پاؤں اٹکنے کا ڈر ہوتا ہے ویسے بھی ساڑھی کے ساتھ ہائی ہیل اچھی لگتی ہے جس پر پہلے سے پابندی ہے۔“

”چلو اچھی بات ہے، ٹائٹ بیڈ۔۔۔“ وہ اسے نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر چل پڑا۔ دروازہ ٹھک سے بند ہوا۔ وہ مسکرا دی۔

”بس کچھ دیر اور۔۔۔ ذرا سی دیر اور۔۔۔ کتنی دیر تک دروازے بند رکھو گے۔ میں دستک نہیں دوں گی اشعب، بس میری چاپ سن کر ہی تم یہ دروازہ کھول دو گے۔ وہ دن دور نہیں۔“

آنچل درست کرتی وہ اس کے پیچھے نکل آئی۔



آج شام وہ کیا سربراہی دینے والی تھی اس سے صرف امی جان واقف تھیں بلکہ انہیں بھی اس نے صبح ہی بتایا تھا۔ ظاہر ہے بجیا کو فون تو ان ہی سے کروانا تھا۔ بجیا نے امی سے شام کو آنے کا وعدہ کر لیا۔ انہوں نے داماد کے لیے خاص تاکید کی تھی۔

اس سربراہی پارٹی کا آئیڈیا اسے پچھلے ہفتے رمشا کی برتھ ڈے پر وہیں آیا تھا۔ پارٹی میں سب حسب معمول تھا۔ وہی بجیا کا گریز، سسرالی عزیزوں کی آؤ بھگت اور حامد بھائی صاحب کی اکثری اکثری گردن۔ اگرچہ یہ اشعب کی سگی پھوپھی کا گھر تھا لیکن اس وقت وہ صرف ان کی بہو کے مکے والے تھے۔ اس طرح الگ تھلگ غیروں کی طرح گید رنگ میں بیٹھے رہے

نہ تھی۔ جب کہ چھوٹی چھوٹی یہ خوشیاں زندگی کو کتنی خوبصورتی بخشتی ہیں وہ اس کا احساس ہی تو حامد بھائی کو دلانا چاہتی تھی۔

ایک کانٹے کے بعد سب کو ایک ایک پرچی دی گئی جس میں وہ نام درج تھے جن کے بارے میں انہیں ایک ایک فقرہ لکھا تھا۔ حامد بھائی اس گیم میں شامل ہونے کے لیے بڑے نخروں سے تیار ہوئے۔

سب سے پہلے کھیل کے اصول کے مطابق لیڈر یعنی ازکی نے اپنی پرچی کھولی اس پر امی جان کا نام درج تھا۔ اس نے مسکرا کر ساس کا شفیق چہرہ دیکھا۔

”امی جان! آپ واقعی میری امی بھی ہیں اور جان بھی۔“

اس سادہ سے فقرے نے ان کا مان کہیں زیادہ بڑھا دیا۔ ان کی آنکھوں میں چمکتے ستارے سے دو آنسو جھللاتے دیکھ کر اشعب نے سوچا۔

”یہ جھللا ہٹ تو میں کب سے دیکھنا چاہ رہا تھا ان آنکھوں میں امی۔“

بچوں نے شور مچا دیا کہ پہلے وہ اپنی پرچیاں پڑھیں گے۔ زید اور بکری پرچیوں پر رمشا اور رمنا کے نام لکھے تھے تو ان کے حصے بھائیوں کے نام آئے۔ چاروں نے بساط بھر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچی۔

اب بچیاں کی باری تھی۔ نام نام پڑھتے ہی ان کے چہرے پر شرمیلیں لالی پھیل گئی سب جان گئے وہ نام کس کا ہو سکتا تھا۔ حامد بھائی بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ کافی دیر سوچتے رہنے کے بعد بچیاں گویا ہوئیں۔

”میری ہر خوشی آپ کی خوشی سے وابستہ ہے۔“
نجانے اس مبہم سے جملے میں کیا تھا جو حامد بھائی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ انہوں نے پرچی پڑھے بغیر ہی مٹھی میں لے کر مسل ڈالی سب حیران ہوئے تو وہ کھمرے ہوئے لمبے میں کہنے لگے۔

”میں نہیں جانتا اس میں کس کا نام درج ہے میں تو صرف اپنی بیگم کے لیے کچھ لکھا چاہوں گا۔ آخر اس تقریب کے روح رواں ہم دونوں ہی تو ہیں۔“

”ہر کسی سے۔۔۔“ سب نے ہالیاں بجا کر داد

لیکن ازکی نے آج کچھ بھی دل پہ نہ لیا۔ اسے بچیا بڑی بے بسی سی اور مجبور نظر آرہی تھیں۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ ان کے دل میں اس وقت کیا کیا جذبات امنڈ رہے ہوں گے۔ ان کا دل چاہ رہا ہوگا رمشا کے ایک کانٹے ہوئے دادی کے ساتھ ساتھ نانی بھی ہمراہ کھڑی ہوں۔ شاید ان کا یہ بھی من ہو کہ ساری مصروفیات سے چند لمحے چراگے وہ کھڑی دو کھڑی اپنے پیارے بھائی کے پاس آ بیٹھیں۔

پہلے ازکی کو بچیا کو سامنے پا کر تپاؤ آتا تھا، آج ترس آ رہا تھا وہ خود کو ان کی جگہ دیکھ رہی تھی۔

”اگر میں امی کو اور طوبی کو حقیقت بتا دوں تو وہ بھی مجھ پر ترس کھائیں گی۔ اور۔۔۔ اور کیا میں اس قابل ہوں کہ مجھ پر ترس کھایا جائے۔۔۔ اس ایک شخص کی وجہ سے۔۔۔ اس نے کچھ دور کھڑے اشعب کو کن اکھیوں سے دیکھ کر سوچا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس ایک شخص کی وجہ سے لوگ مجھ پر رشک کریں۔“ اس کے حوصلے ہر روز پہلے سے بڑھ کر توانا ہو رہے تھے اور ارادے بلند۔

اسے علم ہوا تھا کہ بچیا کی ویڈنگ اینور سری اور برتھ ڈے آگے پیچھے ہی ہیں۔ اس نے دھیان سے اینور سری کی ڈیٹ سنی اور یہ پلاننگ کر لی۔

بچیا اور حامد بھائی کے لیے گفتگو وہ پرسوں ہی لے آئی تھی۔ شام کو کیک کا آرڈر بھی دے دیا تھا اور صبح سے اس کا ایک پیرکین میں تھا (جہاں وہ چائے کے ساتھ پیش کرنے کے لیے اسنیکس کی تیاری کر رہی تھی) تو دوسرا پیر ڈرائنگ روم میں تھا۔ (جہاں کی سجاوٹ منفرد طریقے سے کی جا رہی تھی) اشعب بچیا کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی آفس سے لوٹا اور یہ اس کے لیے بھی سربراہی تھا۔

بچیا تو حیرت اور خوشی کے مارے کتنی ہی دیر گم صم کھڑی رہیں۔ حامد بھائی بھی اس اہتمام سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ بچے الگ پر جوش تھے انہوں نے کبھی ماما بابا کو ویڈنگ اینور سری سیلبریٹ کرتے دیکھا ہی نہ تھا۔ بچیا کے سسرال میں ان خرافات کی قطعی گنجائش

بچیا نے چونک کر دیکھا یہ لہجہ غفلت میں تو انہوں نے بھی اس غری سے اسے پکارنا گوارا نہ کیا تھا۔ اور لب تو غلامی میں بھی بن کے کان ترس گئے تھے اس پکار کو سننے سے۔

منجانباً! آخری میری خوشی ہو۔
وہ بچوں کے اور بھائی کے سامنے اس بے ساختہ انکسار پہ بھیچ کر ضرور گئیں لیکن آنکھوں کی چلیوں میں نہڑتے جگنو اپنی مصیبت بھارے تھے۔

”ہاموں کی باری۔ اب ہاموں آپ کی باری ہے۔“ بچوں کے شور پہ موج میں ڈوبا اشعب چو نکار جی مچھول کر نام نہاد لڑکی دھڑ دھڑ کرنا دل سنبھالے چند فن کو ش ہو گئی۔

”خیر میری مور“ اس نے اپنی بیورٹ ہائی وڈ ایکسپریس کا نام لیا۔ لڑکی نے جھٹکے سے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے خود سب کو رچا ہوا قدیم کی تمیں اور اسے پاؤتھاپہ نام کسی نے نہیں لکھا کیا تھا بالکل۔

”خیر یو جی مور۔ تم کھایا کرو۔ تمہارا وٹ بڑھ رہا ہے۔“
آخری رچی اپنی جان کے حصے میں آئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کھولی اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ پڑھنے لگیں۔

”میرے بچو! اللہ تمہیں یونہی ہنستا مسکراتا رکھے۔“
پول یہ سادہ سی گھریلو سی تقریب سب کو مزادے گئی۔ اشعب نے سب کو ذرا اپنی طرف سے دینے کا اعلان کیا۔ اپنی جان ان سب کے اصرار کے باوجود چلنے پہ راضی نہ ہوئیں بلکہ رمشا اور رمنا جو نیند سے بے حال ہو رہی تھیں انہیں بھی لپٹے پاس روک لیا۔ لوں وہ چہ کے چہ لوگ ایک ہی کار میں سوار پئی سی کے بوئے گلان میں پہنچے۔

سب کے گھٹنیں ملنے کے بعد حاد بھائی کو شایہ کچھ محسوس ہوا اس لیے ڈنر کے فوراً بعد بچوں کو

اشعب اور لڑکی کے اصرار پر جم خانہ ڈراپ کرتے ہوئے اپنی ٹیکم کو لے کر چوکر لڑکی طرف چلے گئے۔
”اچھی تنگ تو بہت چمک رہی تھی۔ یہ اچانک نہ کیوں صدمہ لگ گیا۔“

زید اور بکر کو اپنے کوئی کلاس فیلو مل گئے تھے وہ ان کے ساتھ کپ شپ کرنے لگے اور ان سے کچھ غی فاصلے پہ سونستگ پول کے کنارے دھڑکی چیرن پڑ گئی۔
چلتے ہوئے اشعب نے کھولی کھولی سی لڑکی سے سوال کیا۔

”آپ نے پرچی یہ لکھا نام۔ میرا مطلب یہ ڈیو جی مور کمال سے نکلی ہے۔“
”در اصل میں نہیں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ تو ایک ہی فقرے میں سا سکتا ہے اور۔“ وہ مسکرایا ”اسی سب کے سامنے کہنا مناسب ہے۔“ وہ اب کچلنے لگی۔
”ناؤ دلہ! اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملے کے باوجود وہ کہنے لگا۔

”لڑکی! آخر واقعی لڑکی ہو۔“ شعیب سب سے بہتر سن میرے نزدیک دنیا کی کوئی چیز اب تم سے زیادہ اچھی نہیں اور تم سے زیادہ اہم بھی نہیں۔ ہماری شادی کو چند ماہ بعد ایک سال پورا ہونے والا ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے ابھی ابھی۔ اس ایک میل میں میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور جانتی ہو یہ احساس مجھے گزرے کئی پلاں میں ہوا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ مجھے ہر مل یہ احساس ہو کہ جیسے ابھی ابھی۔“ وہ ان خوبصورت لفظوں کے جذب میں ڈوبنا چاہتی تھی کہ مستحکم ہو گئی۔

”وہیں اشعب بس۔ یہ محبت نہیں جیسے ظہار تفکر ہے۔ کپ اپنی بچا کے لیے جو کچھ سوچتے تھے جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ میں نے کر دکھایا اور اس کے صدمے آپ۔“ اس کی آواز بھر اپنی اس نے ڈنڈائی نظریں اٹھائے سامنے دم بخود بیٹھے اشعب کو دیکھا۔
”میں کسی سہارے کے بغیر کپ کو مانا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جیسے حاد بھائی کو میں نے احساس دلایا کہ ان کی اصل اور کچی خوشی کس سے

میں میری کوئی اور اگر آپ کے دل میں میری احساس چگائے۔ بچا کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب وہ اور وہ چلی گئی تھی آپ نے ان کے ساتھ کچھ اچھا کیا۔ نہ آپ نے نہ ہی جاننے۔“ اشعب ہلچلے مارا تھا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”مجھے سنئے دیکھئے۔“ عورت کی عزت اس میں نہیں اس کے میکے والے اس کے شوہر کی کج بھگت میں اس میں اس عورت کی جگہ بن گئے۔ کیوں؟
”اور ایک حور اپنی بیوی کو صرف بیوی کی حیثیت سے نہ دیکھتا؟ ایک بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ فرائض اور لڑکی شہ اس کے بچوں کی اچھی تربیت کر رہی ہے۔ اس کی نگہ رونا و فادار ہے گھمبیر سب کالی نہیں۔

”اپنا یہ ضروری ہے کہ بیوی کا پورا میکہ اپنی مور کے ساتھ ملنا ہو۔ اس کی مرضی کے مطابق چلے؟“ آپ ایک حاد بھائی کے قدام رخسے سپر کرنا چاہتا تھا۔
”ہاں میں مان کر سمجھتی ہوں کہ بھیا کی قدر بڑھ جائے گی۔ آپ کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ اس عام سی پارٹی نے حاد بھائی کو سر تاپا بدل دیا ہے۔ ہاں عمر کے اس مرحلے کے لیے اور انوکھی زندگی کے گزرنے کی برصا نے اس کچھ سوچنے پہ مجبور ضرور کر دیا ہے میں نے صرف موقع تلاش ہے ایک بہانہ فراہم کیا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ایک موقع ایک بہانہ آپ کو میرے لب لائے۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ آپ میری وجہ سے میرے قریب آئیں۔“

اس کی ساری بات سن کر اشعب نے ایک ٹھنڈی اس بھری اور اس کے جھٹکے جھٹکے سر کو کچ کر کہنے لگا۔
”اچھی لڑکی! آخر اتنی اچھی اور صاف دل کی ہو گئی ہے۔“ وہ لوگ بد ممکن کہتی ہوئے ہیں اس لیے نہیں اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے میں تمہیں نہیں کھاؤں گا۔ صرف اتنی سی اور خواہش کروں گا کہ بس ایک بار لڑکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ من و جو میں کہنے ہر ماہوں تم خود خود یقین کر لگی۔“

اس کے لیے کی بے قراری محسوس کر کے لڑکی نے ناراض ناراض سی نگاہیں اٹھائیں اور شہنشاہ روتی اشعب کے چہرے پہ اتنا کچھ تھا کہ آنکھوں میں ایسے پینم تھے کہ وہ ایک غلطی نے بغیر ہی ایمان لے آئی۔

”مجھے اپنی غلطیوں کا بہت عرصے پہلے سے ہی احساس ہونے لگا تھا۔ تم نا۔ دن میرے دل کے قریب آئی رہیں اور میں شرمسار ہونا یا کہ میں نے ایسا کچھ بھی تو نہ کیا تھا تمہارے لیے کہ تمہاری محبت کا حقدار ہونا یا تم سے محبت کا دعو کرنا لیکن۔۔۔ پھر میں نے سوچا کہ ابھی وقت ختم نہیں ہوا۔ معافی کے لیے بھی اور غلامی کے لیے بھی۔ کیا تم میرے یقین کر دلی کہ میں تم سے صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے قریب نہیں کر دلی۔“

”ہوں۔۔۔ میں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
”ایسے نہیں ہیں ایک بار۔ ایک بار مسکراؤ۔“ وہ ہولے گستاخانہ لڑکی کھٹکھٹا اٹھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

کسی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو (سائیکالوجی)

شائع ہو گیا ہے

خواتین کے سرورق آئسٹ چھاپا گئے، مضبوط جلد،

قیمت 60 روپے

پتا ذیل سے منسوب ہے

- مکتبہ حران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی
- جمہوریہ ایجنسی، فریڈرکٹ کراچی
- سلطان شہزادہ ایجنسی، اخبار، ایکٹ لاہور
- اشرافیہ ایجنسی، لاہور
- سران نیوز ایجنسی، حیدرآباد
- جدید ذہن، لاہور
- مکتبہ حران ڈائجسٹ، کراچی

37 اردو بازار